AFKAR



افکار

-/9/-

جولائی

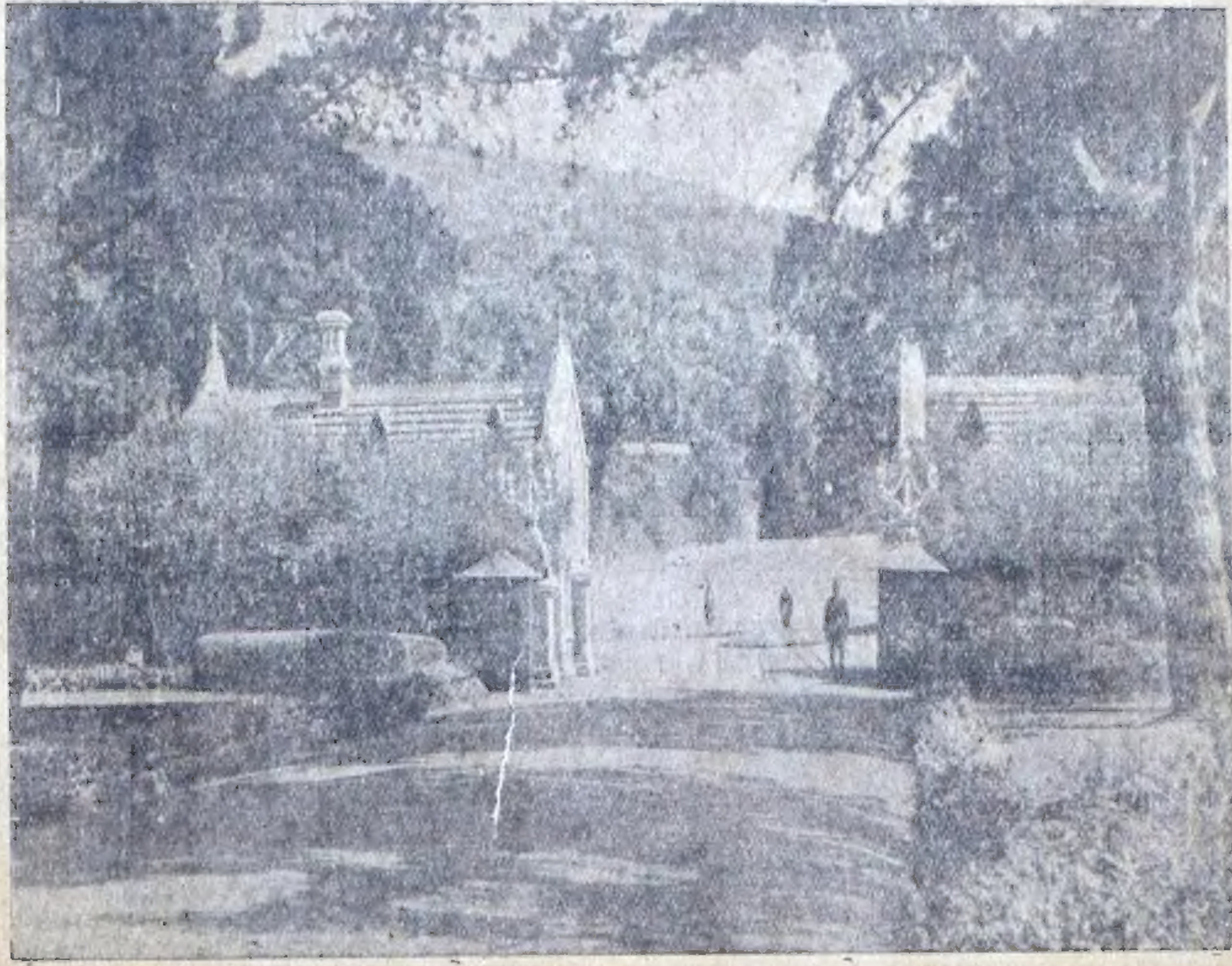
آزادی کے ننھے پودے کو



یاد رکھیئے!

یہ آزادی سیکڑوں برس بعد ملی ہے اور
اسے
ہر حال میں قائم رکھنا ہے

(شائع کردہ محکمہ اطلاعات سرکار بھوپال)



اوٹا کمنڈ—جہاں حال میں ایشیائی کانفرنس منعقد ہوئی۔

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا (اقبال)

جلد ۷
شمارہ ۵　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　جولائی ۱۹۴۸ء

سُرخیاں

ماہنامہ **افکار** بھوپال

زر سالانہ ۵/　　　　　　　　　فی پرچہ ۹/

نگراں
حکیم سید قمر الحسن

ادارہ
رشدی صہبائی

اشاریہ

امرت بازار پتریکا اس خبر کا ذمہ دار ہے کہ یو پی کے وزیر اعظم پنڈت گووند بلبھ پنت نے اجودھیا میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"کانگریس ہندی کا پرچار چاہتی ہے اسی لئے اُس نے حکومت کے نظام
میں ہندی کو رائج کر دیا ہے۔ لیکن سوشلسٹ ہندوستانی کو دیوناگری اور
اُردو رسم الخط میں رائج کرنا چاہتے ہیں، اب یہ فیصلہ کرنا لوگوں کا کام ہے کہ
آیا اُردو رسم الخط سے اُن کا کلچر محفوظ رہ سکتا ہے یا نہیں ———"

ہم حیران ہیں کہ پنت صاحب جیسے ذمہ دار وزیر اعظم آج حصول آزادی کے بعد اس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی بات سوچ سمجھ کر نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ جذبات کی رو میں بہہ رہے ہیں ——— کانگریس ہمیشہ سے یہ دعویٰ کرتی آئی ہے کہ وہ ہندوستانی کی حامی ہے اور مہاتما گاندھی نے بالکل ہی واضح طور پر کہدیا ہے کہ ہندوستانی کو دیوناگری اور اُردو رسم الخط میں ملک کی قومی زبان بنانا چاہئے، پنڈت نہرو اور ڈاکٹر راجندر پرشاد بارہا اس کا اعادہ کر چکے ہیں کہ دونوں رسم الخطوں کو زندہ رکھا جائیگا، پھر بھی کانگریس کی پالیسی سے ایسی چیز منسوب کی جا رہی ہے جو ایک فرقہ وارانہ جماعت کے لئے مناسب ہو تو ہو لیکن ایک اعلیٰ قومی کردار کی جماعت کے لئے یہ کسی طرح بھی شایان شان نہیں ہو سکتی ——— ہندوستان کے وزیر اعظم نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ عوام پر یہ واضح کر دیا ہے کہ کانگریس ایک غیر مذہبی جمہوری حکومت کی خواہاں ہے وہ کسی طرح بھی مذہبی جنون کو خواہ وہ کسی بھی صورت میں ہو اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں۔ ابتک کے مشاہدات سے ہرگز یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ کانگریس کا نصب العین پراچین ہندو کلچر کا احیاء ہے، جیسا کہ پنڈت پنت محسوس کر رہے ہیں، یہ اُن کی سب سے بڑی غلط فہمی ہے کہ اُردو رسم الخط ہندو کلچر کے راستہ میں حائل ہے حالانکہ اُردو زبان مشترکہ کلچر کی میراث ہے جسے ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے خون سے سینچا ہے، یہ بات فہم سے بالاتر ہے کہ اُردو رسم الخط سے ہندوؤں کا کلچر محفوظ نہیں رہ سکتا۔

یو۔ پی، بمبئی، بہار اور دیگر صوبوں میں اُردو کو جس طرح نقصان پہونچایا جا رہا ہے وہ کسی طرح بھی منصفانہ جذبہ کا حامل نہیں ہے، ہم ہندی کے مخالف نہیں ہیں بلکہ ہماری تو یہ رائے ہے کہ اُردو پڑھنے والوں کو ہندی رسم الخط لازمی طور پر سیکھنا چاہئے اور اُسے ہر طرح اپنانا چاہئے۔

مرکزی حکومت کو صاف طور پر اپنی لسانی پالیسی کا اعلان کر دینا چاہئے تاکہ عوام کسی قسم کے تذبذب میں مبتلا نہ رہیں اور جو صوبائی حکومتیں غلط راستہ اختیار کر رہی ہیں اُنھیں فوراً ٹوک دینا چاہئے، ورنہ ایک غیر مذہبی جمہوری حکومت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

اس اشاعت میں انور عظیم، گربچن سنگھ، اور عزیز عرفی کے افسانے، اصغر انصاری، عابدہ اور رکمین احسن کلیم کے مضامین شامل ہیں اور حصۂ نظم میں آپ کے بلند پایہ اور مشہور شعراء کا کلام ملیگا۔

(ادارہ)

مدّوجزر

الوداع و خوش آمدید

گذشتہ ماہ تاریخ عالم کے ایک یادگار باب کا اختتام ہوا، ہندوستان سے ہمیشہ کے لئے برطانوی اقتدار کا خاتمہ ہوگیا، جن افرنگیوں نے ہند کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا تھا وہ خود ہی اس کو آزاد کرکے چلے گئے، ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن مسٹر سی، راجگوپال آچاریہ کو اپنے عہدہ کا چارج دے کر رخصت ہو گئے ــــــ ہندوستان میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا دور آخری برطانوی گورنر جنرل کی حیثیت سے ہمیشہ یادگار رہیگا، کیونکہ ان کے زمانہ میں ہندوستان کو آزادی حاصل ہوئی، اور دو آزاد مملکتوں کا قیام عمل میں آیا، اُس وقت ہندوستان ایک نہایت ہی ناازک دور سے گذر رہا تھا، ماؤنٹ بیٹن نے ہوا کے رُخ کو پہچان لیا، ادھر برطانوی گورنمنٹ نے یکم جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستان خالی کر دینے کا اعلان کر دیا، خیال تھا کہ اس اعلان کے دباؤ سے مخالف عناصر میں اتحاد ہوجائیگا۔ لیکن ایسا نہیں ہوسکا فرقہ وارانہ تلخی عروج پر پہونچ گئی، ماؤنٹ بیٹن نے حالات کا جائزہ لے کر کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں سے گفت وشنید کی اور پھر برطانوی حکومت سے لندن جاکر مشاورت کی جس کے نتیجہ میں ۳ جون کا تاریخی اعلان ہوا، اس طرح ملک دو حصوں میں بٹ گیا اور باہمی کشمکش کی فضا دور ہوگئی۔ ماؤنٹ بیٹن کا فی الواقعی یہ زبردست کارنامہ ہے ــــــ ریاستوں کو ہند یونین میں ضم کرنے کا سہرا اگرچہ سردار پٹیل کے سر ہے لیکن اس کے پس منظر میں لارڈ موصوف کا ہاتھ ہے۔ تاریخ ہند میں یہ دور ہمیشہ نمایاں اہمیت کا حامل رہے گا ــــــ مسٹر راجگوپال آچاریہ اب ہند کے نئے گورنر جنرل ہوگئے ہیں وہ ہندوستان کے تجربہ کار، دانشمند اور مدبر کانگریسی ہیں۔ اس عہدہ کے لئے اس وقت آپ سے زیادہ کوئی موزوں آدمی نہیں تھا۔ مسٹر راجگوپال آچاریہ پہلے ممتاز کانگریسی ہیں جنھوں نے تقسیم کا اصول بہت پہلے مان لیا تھا، اور ملک کے سامنے اپنے خیالات صاف طور پر پیش کر دیئے تھے، ان کی دوربین نگاہیں آج کے نقشہ کو پہلے ہی سے دیکھ رہی تھیں، کاش ان کی اسکیم پہلے ہی سے مان لی گئی ہوتی تو ہمارا ملک بہت سی تباہیوں اور خرابیوں سے محفوظ ہو جاتا اور ہندوستان اور پاکستان کو دنیا کے سامنے انسانیت سوز اور شرمناک حالات کے لئے شرمندہ نہ ہونا پڑتا۔

مسٹر آچاریہ کو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا اعتماد حاصل ہے اور وہ ہر طبقہ میں یکساں ہردلعزیز ہیں۔ اگر ہندوستان کے دستور میں صدارت کا معاملہ طے ہوا اور برما اور چین کی طرح یہاں بھی صدر کے عہدے کو رائج کیا گیا تو غالباً ہند کے پہلے صدر بھی مسٹر راجگوپال آچاریہ ہی ہوں گے۔

ہم بیشمار نیک تمناؤں کے ساتھ اُن کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ راستہ اگرچہ کٹھن اور دشوار ہے، مگر ہمیں اُمید ہے کہ وہ اپنے مدبرانہ فہم و فراست کے ذریعہ ان مشکلات پر ضرور قابو پالیں گے۔

(ادارہ)

سنگ و خشت

دیریش

جلتے جلتے ہندوستان کے آخری گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن "ہندی" میں اپنا آخری سندیسہ بھی دے گئے ہیں ملاحظہ فرمایئے :۔

"دہلی کے باسیو، میں اور میری "شریمتی" بہت خوش ہیں کہ اس سمے پر اتنی بڑی پارٹی جمع ہوئی ہے۔ لیکن آپ کی دوستی اور پریم ہمیشہ ہمارے دل میں رہیگا میں ہندی نہیں جانتا ہوں، اس لئے میں پورا بھاشن ہندی میں نہیں کر سکتا، باقی انگریزی میں بولوں گا، میں اور میری شریمتی آپ کا دھینہ واد کرتے ہیں، ایشور آپ کی سہائتا کرے"۔۔۔۔

کیا ہم اُمید کریں کہ ہندوستان کے قومی میوزیم میں یہ پیغام محفوظ رکھا جائیگا ۔۔۔ ایک انگریز کی یہ ہندی کیسا لاجواب شاہکار ہے ؟۔۔۔۔

"افکار" کے خاص نمبر پر جہاں ہمارے کئی معاصرین نے تبصرے شائع کئے ہیں ۔۔۔ وہاں ایک مقامی رسالہ کے مدیر "سردبیر" نے خاص نمبر کے دو اشتہارات کی بھی تصویر سمجھ کر تعریف کر ڈالی، اس "سخن فہمی" اور "ذہانت" کی داد نہ دینا بیداد ہے، ہم تو صرف یہ ہی کہہ سکتے ہیں اللہ کرے "حسنِ نظر" اور زیادہ ۰

آجکل ہمارے "صہبا لکھنوی" پاکستان میں براجمان ہیں، "افکار" کے کراچی آفس کی تنظیم میں مصروف ہیں، اپنے تازہ خط میں وہاں کی ادبی فضا کا یوں تذکرہ کرتے ہیں "آج میں اپنی "برادری" کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا قمر ہاشمی کو ڈھونڈا تو رئیس احمد جعفری مل گئے "خدنگ" والے خلیق سے ملنے گیا تو رئیس امروہوی مل گئے، آغا سرخوش بھی نظر آ گئے، رئیس احمد جعفری سے پہلے یکایک "ڈان" کے دفتر کے قریب نسیم سندیلوی مجھ سے ٹکرا گئے "بھئی خوب ملے" کے بعد اچھی طرح ملے، وہ صورتیں جو لکھنؤ، دہلی اور بمبئی میں نظر آتی تھیں، اب پاکستان میں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں"۔۔۔۔

ظاہر ہے کہ اب اُردو کا مرکز پاکستان ہی میں بن رہا ہے اسی لئے یہ صورتیں وہاں "لالہ و گل" میں نمایاں ہو گئی ہیں !

ہم تو سمجھتے تھے کہ "حضرت قیس" کی دنیا صرف عشق تک محدود تھی لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ "صحافت" میں بھی آ گئے ہیں چنانچہ بمبئی سے ایک ہفتہ وار　　اعلیٰ حضرت عالی مرتبت امیر کاروانِ محبت، خضر راہ الفت، تاجدار جنون و وحشت، امام العاشقین، اعلیٰ حضرت قیس بن عامری شہزادہ نجد عرشِ آشیانی کی یادگار میں بہت جلد "منصہ شہود" پر جلوہ گر ہونیوالا ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ بلا تفریق مذہب و ملت دنیا بھر کے محبت کرنیوالوں کا ترجمان خصوصی ہوگا۔

آخر کیوں نہ ہو ۔۔۔۔

ہم پہ نازل ہوا صحیفۂ عشق
صاحبانِ کتاب ہیں ہم لوگ

آبگینے

حقیقی شعر کائنات کی حسین ترین تفسیر ہے۔!

رُباعیات

یہ چرخ، یہ خورشید، یہ انجم، یہ قمر
یہ قوسِ قزح، یہ دشت، یہ سبزۂ تر
یہ سرو، یہ سنبل، یہ شگوفے، یہ شفق
تم ہوتے تو کاہے کو بھٹکتی یہ نظر

جب عطر سا برسائیں گے تیری گیسو
مہکے گا گل عیش سے تیرا پہلو
اُس وقت بھی اے دوست تری آنچل سے
آئے گی کسی کے آنسوؤں کی خوشبو

یہ نشہ دماغ و دل پہ کیسا چھایا
یہ روح میں اک گیت سا کیا لہرایا
رگ رگ میں شرارے سے یہ کیا دوڑ گئے
سینے پہ مرے پڑا یہ کس کا سایا

گاتی ہوئی کرنوں کو تو سُن لینے دے
اک جال تو اُمید کا بُن لینے دے
اے رات! ٹھہر اپنے ستاروں سے مجھے
ان کے لئے کچھ پھول تو چن لینے دے

سو بار کرن ابر میں چھپ کر لپکے
اوجھل ہو ہوا میں رنگ گل کا بچ کے
فطرت کے یہ پوشیدہ کرشمے لیکن
جائیں گے کہاں میری نظر سے بچ کے

رہ رہ کے ہوا دل کی بدل جاتی ہے
صحبت کبھی پھولوں کی بھی کھل جاتی ہے
لیکن کبھی اک سانس جو لیتی ہے کلی
سینے کی ہر اک پھانس نکل جاتی ہے

جاں نثار اختر

گماں

کبھی کبھی انھیں مجھ پر گماں یہ ہوتا ہے
کہ جیسے میری محبت ہے ایک خوابِ جنوں
کہ جیسے میری نگاہوں میں ہے ہوس کا فسوں
کہ جیسے گیت وفا کے میں گا نہیں سکتا
فرازِ عشق کو جیسے میں پا نہیں سکتا

کبھی کبھی انھیں مجھ پر گماں یہ ہوتا ہے
کہ جیسے لے کے انھیں بے قرار بانہوں میں
میں اُن کو چھوڑ بھی دوں گا بھٹکتی راہوں میں
جگا کے اُن کی تمنا کا شعلۂ شاداب
میں ڈھونڈ لاؤں گا جیسے کوئی نیا مہتاب

سب وہ ساعتِ نایاب جب گماں ہو انھیں
نظر اداس، فسردہ جبیں، فسردہ لٹیں
ادا اداسے گریز اور احتیاط عیاں
خفا خفا سی نگاہیں، چڑھی چڑھی سی کماں

ہر ایک بات پہ چپ، ہر سوال پر خاموش
ہزار طرح کی بے التفاتیاں بردوش
بدن چھپائے، ادائیں چرائے، خم دیدہ
گماں کے رنگ میں رنگِ یقیں غلطیدہ

مگر بس ایک ہی لمحے میں یہ گماں کے جال
شکستہ ہوتے ہیں، چھٹتی ہے رخ سے گردِ ملال،
مری جواں امنگوں کی آتشِ بے باک
گمان و وہم کو دیتی ہے جلا کر خاک
وہ ہانپتی ہوئی سانسیں، وہ چھیڑ چھاڑ، وہ میل
گداز باہوں سے، زلفوں سے، دستِ شوق کے کھیل
نئے نشے سے وہ پیماں، وہ آرزو، وہ امید
وہ رازِ عشق میں پھر احتیاط کی تاکید

دلوں سے کھوٹ کا ہر رنگ جاتا رہتا ہے
گماں کے بعد یقیں مسکراتا رہتا ہے

اشعر ملیح آبادی

دیوانے دو

"شرارت کس لئے آلودۂ وحشت ہوئی آخر؟
یہ رنگین قہقہوں میں تلخیاں سی کیوں چھلک اٹھیں؟
یہ آنکھیں آہ یہ معصوم آنکھیں کیوں چھلک اٹھیں؟
تمہارا دل دکھانے کی کسے جرأت ہوئی آخر؟"

"جہاں طوفاں کا مسکن ہو بجلی کا نشیمن ہو
وہاں نخلِ تمنا بار ور ہو ہی نہیں سکتا
نسیم صبحگاہی کا گذر ہو ہی نہیں سکتا
کوئی الزام کیوں دے شبنموں کی چشم پُر نم کو
کہ یہ ساغر ہی اشکوں کے لئے تخلیق ہوتے ہیں
میں اکثر رات کی افسردگی پر دل دکھاتی ہوں
اور ان بیکس ستاروں کے لئے آنسو بہاتی ہوں
سحر ہوتے ہی بیچارے اجل کی نیند سوتے ہیں"

"نظامِ دہر میں گنجائشِ چون و چرا کب ہے!
کلی کے خون سے ایوانِ گل تعمیر ہوتا ہے
بہاریں گنگناتی ہیں خزاں کا ساز روتا ہے
چراغِ یاس سے اُمید کا سایہ جدا کب ہے؟!
نہیں تاریک پہلو ہی سے جانے کیوں محبت ہے!
حسین لمحات کو افکاریں کھونے سے کیا حاصل!
چمن میں بیٹھ کر ویرانیوں کا سوگ لا حاصل
ذرا سی عمر اور مایوسیوں سے عشق حیرت ہے!!"

"مسرت کی ہلاکت آفرینی کو نہیں سہتے
ملا دیتی ہے ہر ہر گھونٹ میں زہراب غم اتنا
کہ مرنا چاہتا ہے اور انساں مر نہیں سکتا
نگاہیں خون روتی ہیں مگر آنسو نہیں بہتے
نہیں معلوم شاید آپ کو ماضی کے غاروں میں
مرے بے حس تبسم کے شرارے اب بھی روشن ہیں
جنونِ ضبط کے بے باک تارے اب بھی روشن ہیں
مگر اب کیف کا فقدان ہے مصنوعی بہاروں میں
یہ مستقبل کے سائے اب مجھے جینے نہیں دیتے
میں اب سہمی ہوئی پرچھائیوں سے کانپ جاتی ہوں
میں ان ہاری ہوئی تاریکیوں سے کانپ جاتی ہوں
مجھے موہوم نشتر چاکِ دل سینے نہیں دیتے"

"تمہارے قہقہوں سے خستگی کی داد چاہی تھی
مگر تم بھی مرے افکار کا پرتو نکل آئیں ---!
چراغِ آرزو کی ٹمٹماتی لو نکل آئیں ---!!
چلو اک ہم نفس کو جراتِ ہشیار ترستی تھی !!!
تم اپنے آنسوؤں کی شعلہ سامانی مجھے دیدو
میں ان خاموش انگاروں سے رگ رگ بربط بناؤں گا
اور اس پر عزم کی دھن میں دہکتے گیت گاؤں گا
ذرا مجھ سے یہ تنہائی کا احساسِ گراں لے لو!!
وہ مستقبل کے رخساروں سے ماضی کا نقاب اٹھا
بھیانک حال کی تاریکیاں دھندلائی جاتی ہیں
کوئی دم میں یہاں کرنیں ہی کرنیں آئی جاتی ہیں
وہ دیکھو وہ افق کے پار اپنا آفتاب اٹھا!!
چلو ان شوخ کرنوں کو زمانے بھر میں پھیلا دیں
ہم اپنے آتشیں نغموں سے خونِ دہر گرما دیں!!"

نور بجنوری

صبح نو

نئی سحر میں دھندلکے بدلنے والے ہیں

چمن کی خاک پہ مشغولِ رقص پیہم ہے
تمام جوشِ بہاراں، تمام سیلِ نمو

ابل رہے ہیں سرورِ خودی کے فوارے
چھلک رہے ہیں نشاطِ خود آگہی کے سبو

چمک رہا ہے فضا میں خلوص کا پرچم
بسی ہوئی ہے فضا میں حیات کی خوشبو

فلک پر آخرِ شب کی لکیر ڈور چلی
زمین نے کھول دیئے اپنے ریشمیں گیسو

خود اپنے کیف میں سرشار بادۂ احمر
خود اپنی آگ میں بیتاب لالۂ دلِ جو

سکوتِ شوق میں ڈوبے ہوئے زمان و مکاں
طلسمِ حسن سے معمور عالمِ من و تو

وہ شاخ تاک جھکی، روحِ نیستاں جاگی
وہ مسکرائے ترانے، وہ جگمگائے کدو

مری نگاہ سے ہے دل کی واردات عیاں
مری نوا میں ہے رخشاں مرے جگر کا لہو

یہ آب و تاب نہ تھی نیم وا شگوفوں میں
مجھے یقین ہے کہ موجِ ہوا میں ہے جادو

وہ راگ چھیڑ گئی ہے نسیمِ نرم نرم
کہ شعلہ زن ہے رگِ خار و خس میں ذوقِ نمو

نہ اب وہ گردشِ افلاک ہے نہ دردِ حیات
نہ اب وہ رشتۂ زنار ہے نہ ظرفِ وضو

تمام طوق و سلاسل پگھلنے والے ہیں!

افسر احمد نگری

انتظار

حرج ہی کیا ہے جو انسان گنہگار بنے
زندگی! — سوچ رہا ہوں کہ تجھے اپنا لوں!
کسی احساس کا پرتو — نہ محبت، نہ جنوں
اضطرابِ غم و آفات، مسرت، نہ سکوں
سازِ جذبات پہ ہے گریہ کناں سوزِ دروں،
حرج ہی کیا ہے جو انسان گنہگار بنے؛
اور محبت ابدیت کا بھی شہ کار بنے!!

موج تو موج — سفینہ بھی نہیں ہے اپنا،
دست و بازو کی توانائی بھی پائندہ نہیں
کسی گرداب کی ہمنائی بھی پائندہ نہیں
ان ستاروں کی اک انگڑائی بھی پائندہ نہیں
کیا قیامت ہے کہ تنہائی بھی پائندہ نہیں
موج تو موج — سفینہ بھی نہیں ہے اپنا
اپنے ماتھے کا پسینہ بھی نہیں ہے اپنا!!

آب و گِل کی یہ بہاریں تو بہت آئیں گی!
میرے حصے کی چھلک جائے تو ساغر کیا ہے؟
نہ ہو احساس — تو قربِ محبت کا اثر کیا ہے!
لاکھ دلکش ہو — نظر ہی نہیں — منظر کیا ہے؟
لاش کے واسطے پھولوں بھرا بستر کیا ہے؟
آب و گِل کی یہ بہاریں تو بہت آئیں گی،
میں نہ ہوں گا — تو کسی اور سے شرمائیں گی!!

روشنی سی نظر آتی ہے دھندلکوں کے قریب!
میں نے دیکھے ہیں سرِ راہ منازل کے خرام
یونہی ڈھلتے ہی رہیں گے یہ جواں سال اجسام،
ماہِ نو بنتا ہی رہے گا یونہی مہتاب تمام — !
سازِ تخریب پہ تعمیر کا یہ رقصِ دوام!
روشنی سی نظر آتی ہے دھندلکوں کے قریب
اور لرزتے ہیں ستارے مری پلکوں کے قریب!!

...... اور یہ لمحات بھی خاموش ہوئے جاتے ہیں
یہی لمحات جو تخریبوں میں، تعمیروں میں،
میرے خوابوں میں، مرے خوابوں کی تعبیروں میں،
میرے افسانوں میں، افسانوں کی زنجیروں میں،
قید تھے رنگ میں تخیّل میں، تصویروں میں!
اب وہ لمحات بھی خاموش ہوئے جاتے ہیں
آخری سائے بھی روپوش ہوئے جاتے ہیں!!

کمال احمد صدیقی

بادل کا گیت

دھرتی تیری پیاس پرانی
کیوں آنچل کو تھامے!

میں ساگر کی آنکھ کا سپنا موجوں کا سنگیت
جل پریوں کا کومل نغمہ، آنسو بھرا اک گیت

تیری چاہت ہاتھ پسارے
وادی وادی، مجھے پکارے

تو سینے کے گھاؤ دکھائے میرا درد نہ جانے
تیرے پتھر پہ پھول کھلاتے بیتے کئی زمانے
پھر بھی بھوکی پیاسی بلکے کیوں تیری سنتان
کس نے چھینی کس نے لوٹی چہروں کی مسکان

کتنے نینا چھم چھم برسیں
کتنے ہردے پیار کو ترسیں

جب یہ سوکھے جسم خوشیوں سے لے اتنار
تب چونکیگا تب جاگیگا میرا سویا پیار
تیرے پتھریلے سینے میں پھول کھلاؤنگا

اور سبز بالی بن کر تیری باہوں میں سو جاؤنگا!

نشاط شاہدوی

زاویۂ نظر!

خیال و فکر بار ہا اپنے تولتے رہے
فضائے آسمان کے ستارے رولتے رہے
مگر یہ سنگریزے اس زمین کے مری نگاہ کو ترس گئے
بہشت زار وادیاں
یہ زر نگار گلستاں
یہ کوہسار و آبشار و آب و گل کا یہ جہاں
مری ہی کم نگاہیوں سے خار زار بن گیا
مری نظر ہمیشہ کہکشاں کے جھولے جھولتی رہتی

ازل سے میں ابد تلک کی وسعتوں پہ چھا گیا
تصورِ زماں کو میں نے جاوداں بنا دیا
مگر یہ چند لمحے زندگی کے سسکتے رہ گئے
تصورِ مکاں کو میں نے لا مکاں میں ضم کیا
مگر یہ کرۂ زمیں جہنموں (کا) گھر بنا رہا

یقیں کی گتھیاں کہ جن کو بے خودی سے حل کیا تھا بارہا
انھیں حقیقتوں نے آج مجھ سی کو ناگ بن کے ڈس لیا

یہ کیا ہوا —؟ یہ کیا ہوا —!
ستارے آسمان کے
زمیں کے بکھر بکھر کے سنگریزے بن گئے
مری نظر بھی پستیوں میں اوج سے اتر گئی

قاضی سلیم (علیگ)

غزل

جب سے انوار نظر بھر کے تمہارے دیکھے　　چاندنی دیکھی نہ چھٹکے ہوئے تارے دیکھے

پاؤں کے خون سے پُر لطف نظارے دیکھے　　خارِ صحرا کی جگہ سُرخ ستارے دیکھے

دن کٹا رات گئی صبح قیامت آئی　　دیکھے دیکھے ترے وعدوں کے سہارے دیکھے

منظرِ نور ترے حُسن کی دنیا پائی　　ذرّے ذرّے میں چمکتے ہوئے تارے دیکھے

ہم نے جانا کہ ہیں ذرات پریشاں دل کے　　جب کہیں دشت میں ٹوٹے ہوئے تارے دیکھے

چیز کیا تھی مرے دل کی متزلزل ہستی　　اس سے بڑھ بڑھ کے فنا کار نظارے دیکھے

ہائے اُس منظرِ دید کا عالم، جس نے　　پردۂ صبح میں چھپتے ہوئے تارے دیکھے

رنگ بھرنا ہو جنوں کا جسے اپنے دل میں　　تیری تصویر کے خاموش اشارے دیکھے

دلکشی خاص ہے کیا شہرِ خموشاں میں ذکیؔ
سب نے لب کشورِ ہستی کے کنارے دیکھے

ذکیؔ بھوپالی

غزل

محبت اضطرابِ جادہ داں معلوم ہوتی ہے
یہ منزل خود شریکِ کارواں معلوم ہوتی ہے

تڑپ بے سود حسرت رائیگاں معلوم ہوتی ہے
فغاں جب تک محبت میں فغاں معلوم ہوتی ہے

پیامِ مرگ حشرِ زندگی کو آ کے چونکا دے
یہ میٹھی نیند اب خوابِ گراں معلوم ہوتی ہے

قیامت ہے ترے غم کی لطافت کو سمجھ بیٹھا
مجھے اب اپنی ہستی بھی گراں معلوم ہوتی ہے

بہر لحظہ، بہر لمحہ تغیر ہی تغیر ہے
وہاں دُنیا نہیں ہوتی جہاں معلوم ہوتی ہے

محبت نام ہے ایسی بلندی کا جہاں اکثر
اثر ہی کیا فغاں بھی رائیگاں معلوم ہوتی ہے

بہت دن بعد آیا ہوں گلستاں میں رہا ہو کر
مجھے ہر شاخ، شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

تری موجودگی اور میری ہستی اے معاذ اللہ
یہی قربت حجابِ درمیاں معلوم ہوتی ہے

فریبِ حُسنِ جاناں سے ذرا ہشیار اے شعریؔ
کہ وہ کافر نظر پھر مہرباں معلوم ہوتی ہے

شعریؔ بھوپالی

زخم اور قہقہہ

جنون

میں انسان ہوں

آبشار

ہر حقیقت ایک خاموش افسانہ ہے اور ہر افسانہ ایک بے حجاب حقیقت!

انور عظیم

زخم اور قہقہہ

دیواریں جھنجھنا اٹھیں۔ اس نے پنسل پھینک دی، اور امتحان کی کاپیاں، جن پر سرخ نشان یہاں وہاں، ابھرے ہوئے تھے، کنارے سرک گئیں۔

"چہرہ ہو تو ایسا، کیا مراد آبادی کام ہے ——"

"ہاہا —— ہاہا!"

"بہت چیچک زدہ شکلیں دیکھی ہیں، پر ایسی غضب کی نہیں"

"ہاہا —— ہاہا"

لگاتار دیواریں جھنجھناتی رہیں۔ اور اس کے چہرے پر ایک دھندلکا سا چھا گیا۔ جیسے ابھی ابھی چولھے میں ایندھن ڈالکر نکالا ہو۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں، انگارے کی طرح

"معلوم ہوتا ہے چہرے پر شہد کی مکھیوں کا چھتہ جڑ لیا ہے" ....

"ہی ہی ہا —— ہاہا"

وہ ایک بنجی، ور لنگی پہنے ہوئے تھا۔ گنجی کے اوپر والے کھلے ہوئے حصے میں اس کی گردن کی ہنسلیوں کا ابھار بہت نمایاں تھا۔ سینے کے بال بھی اوپر کی طرف رخ کئے ہوئے، رینگتے چلے آرہے تھے، اور ٹھیک وہیں پر چیچک کے زخموں نے ایک ابدی نشان چھوڑ دیا تھا۔ جیسے کا میاں ٹھونک ٹھونک کر نکال لی گئی ہوں۔ اس کے دانت اوپر تلے نکلے ہوئے تھے۔ اور انگلیوں میں جڑے ہوئے قدرے تیز ناخنوں سے وہ اپنی رانوں کو نوچنے لگا، آنکھیں اور سرخ ہو گئی تھیں۔ اور اب اس میں سے بھاپ کی ہلکی ہلکی، نم تپش جھانک رہی تھی۔ جب کبھی دیواریں گونج اٹھتیں تو اس کی آنکھوں کے سرخ رنگ میں ترقی ہو جاتی، اور مزید اضافہ کے طور پر، ہلکی ہلکی نم بھاپ، سوئی سوئی، دھواں دیتی ہوئی تپش جس کی گہرائی میں ایک لو سی جھلملا جاتی۔

"میں چلا۔ مجھے جلوس میں جانا ہے۔ تم لوگ بھی چلو۔ کسی بدصورت آدمی پر چوٹ کرنے سے فائدہ۔ چلو اٹھو ——"

دیوار جھنجھنائی ضرور، مگر یہ وہ قہقہہ زن، آوازہ کسنے والی آواز نہ تھی۔ مگر اس آواز نے، —— رحم کی بھیک اور انسانیت کی پھوار لیکر ابھرنے والی آوازنے اسے اور بھی بے چین کر دیا۔

"تم جاؤ، ہم موڈ میں ہوں گے تو آجائیں گے ——" یہ دونوں بے فکروں کی آواز تھی؛ جن پر اسے نسبتاً کم غصہ آتا تھا اور اس کے کمرے کے دروازہ کے سامنے سے ایک نوجوان لڑکا، ایک خاکی پتلون اور قمیص پہنے گذر گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمڑے کا تھیلا لٹک رہا تھا۔ اس نے بالوں کو پانی چھڑک کر برابر کر لیا تھا —— وہ تیزی سے زینوں کے اتار میں ڈوب گیا۔

ایک ہی دیوار کی تو بات تھی۔ لیکن وہ اس پتلی سی دیوار کو نہیں توڑ سکتا تھا۔ ایک ہی کمرے کے دو حصے تھے، ایک ٹین کی اوٹ کی مدد سے کمرے کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ دونوں کمروں کی ہلکی سی آواز بھی ایک دوسرے میں تڑپ جاتی تھی، بالکل پاکستان اور ہندوستان کی آوازوں کی طرح۔ اور دونوں پر اسی طرح، ایک دوسرے کا ردعمل ہوتا تھا

وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھا۔ ایک دق کے مریض کی طرح جیسے سہا۔ دیکھا اٹھا یہ دیوار ہو۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا گالیاں بکتے ہیں کم بخت ۔۔۔۔ اگر یہ دیوار ٹوٹ جاتی تو بدلا ضرور لیتا، سر توڑ دیتا ہر دو دل کا۔ مرادآبادی چہرہ ۔۔۔ قسم خدا کی کیا ہے اتنی بن ہے۔ نہ جانے ان لوگوں کا چہرہ ایرانی اور مصری کیسے ہو گیا۔ کالج میں پڑھتے ہیں۔ سوچتے ہوں گے ڈگریاں لیکر آسمان میں آگ لگا دینگے۔ یہاں بھی ڈگری موجود ہے۔ اور خاکسار بھی آسمان میں آگ لگانے کی بات سوچا کرتا تھا۔ یہ اب جھک رہا ہوں۔ سر سے لیکر پاؤں تک جھک ہی جھک۔ جی یہ انجام ہوتا ہے۔ طعنے کام نہ دینگے۔ اور میں پیدائشی کریہہ صورت تھوڑا ہی ہوں، چیچک ۔۔۔ عجیب بیماری ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اسے اپنا چیچک زدہ چہرہ یاد آگیا، جو اس نے پچپن میں بیماری کی حالت میں آئینے میں دیکھا تھا۔ کالی چیونٹوں میں تیزاب بھر کر اس کے چہرے پر انہیں بو دیا تھا۔۔۔ اس بری طرح کہ تل دھرنے کے سرکنے کی جگہ نہ رہ گئی تھی۔

پھر دیوار بج اٹھی۔ اور وہ چیخنے چیختے رہ گیا۔ وہ ہمیشہ چیختے چیختے رہ جایا کرتا تھا۔ اس کی آواز کے خلاف اس کے حلق میں ہزاروں چیچک کے دانے ایک لمحے میں نکل آئے تھے، اور اس کی آواز ایک ایسی ڈکار بن کر رہ جاتی جو باہر نہ آسکے۔

قریب قریب، یہ روز کا دستور ہو گیا تھا۔ اس کے چہرہ، اس کا لباس، اس کی جنسی رجحان کے طور پر کبھی کبھی ابھر آتی تھی اور جس کی حیثیت اس غیر مالک کی ہوتی تھی جیسے کسی بانجھ عورت کی گود میں زبردستی ٹھونس دیا جائے، اس کی گفتگو، اس کی کمرہ اور نہ جانے کس کس چیز پر، بغل والے کمرہ میں گلا پھاڑ پھاڑ کر تبصرہ ہوا کرتا تھا۔ جس میں دو آوازیں خاص طور پر حصہ لیا کرتی تھیں وہ آوازیں جن میں رحم نہ تھا، دشمنی تھی، بغض اور حسد تھی۔ وہ عاجز تھا۔ مکان کی دقت نہ ہوتی تو وہ ضرور کہیں بھاگ جاتا۔ پنجاب کے پناہ گزینوں کی وجہ سے مکان کا مسئلہ ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ اس لئے جو بھی دال، وہی بستر تھی، نعمت تھی۔ اور اس پس منظر میں لئے بھی اپنا کمرہ رشکِ فردوس، اور جنت نگاہ نظر آتا تھا۔ مگر جب دیواریں جھنجھنا اٹھتیں، قہقہے ابلنے لگتے، تو کمرہ جہنم زار بن جاتا تھا۔ اور کم از کم اس وقت تو وہ کمرہ چھوڑ دینے کا فیصلہ ضرور کر لیتا تھا۔ جو دیرپا نہیں ہوتا تھا، اور تجربے سے یہ بات بھی ظاہر ہو گئی تھی کہ ایک آدھ سلیقے کا کمرہ ملنے کی نوبت بھی آئی تو وہ اسے ٹال گیا۔ حالانکہ اس روز بھی دیواریں گونجی تھیں، قہقہے ابلے تھے اور اس کے حسن جہاں سوز پر گہر افشانی کی گئی تھی۔

وہ سنجیدگی سے اس مسئلہ پر سوچتا تو اس کے سوچنے کا ڈھنگ بھی بہت مربیانہ ہو جاتا تھا ۔۔۔۔ ایک اسکول ماسٹر جسے دن رات، طرح طرح کی فکریں مت یا کرتی ہیں، جسے آئے دن، تازہ مصیبتیں، اور پریشانیاں دیمک کی طرح چاٹا کرتی ہیں ۔۔۔ ہاں اسی اسکول ماسٹر یعنی کولہو کے بیل کو، ایک ہلکے آرام، ایک ہلکی خواب ناک تسکین اور ترنم اور موسیقی سے لبریز ذہنی جنت کی تلاش اور خواہش بیقرار کر دیتی ہے۔ وہ اسی ننھی تمنا کو اپنی زندگی کا محور بنائے ہوئے تھا۔ مگر ان لفنگوں اور اٹھائی گیروں کو ذرا حس نہ تھی۔ اس پر رحم نہ آتا تھا۔ اور اگر ستیش کو رحم آتا اور وہ اس کی سفارش اپنے دو ساتھیوں سے کرتا، انہیں ڈانٹتا تو گویا اس کے زخموں پر نمک پاشی ہو جاتی۔ ستیش کی ہمدردیاں اس کے ٹھنڈے چیچک کے داغوں میں از سر نو روح پھونک دیتی تھیں، اور وہ سارے داغ ایک بار پھر ہری بھری کھیتی بن جاتے ۔۔۔۔ اور وہ تلملا اٹھتا۔ اسے کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بھکاری نہیں تھا، بھکاری نہیں تھا۔

پھر دیوار چیخ اٹھی۔ گالیوں کا انگارہ اس کے دماغ میں لپکنے لگا۔ وہ تلملا اٹھا۔ جیسے سیکڑوں پتھر تڑا تڑ اس کے چہرے پر آ لگے ہوں۔ آخر اس دیوار کا فائدہ کب تک اٹھایا جائے گا۔ کب تک چھپ چھپ کر مجھے گالیاں دی جائیں گی۔ میں اس بازاری سفلہ پن کو کب تک سہتا رہوں گا۔ حد بھی ہوتی ہے کسی بات کی۔ اور وہ مکڑی کے جالے کی طرف تکنے لگا، جو کڑی کے اوپر دیوار کے پاس زاویہ بناتا ہوا، زیر تعمیر تھا اور وہ دیکھ رہا تھا، جیسے سر سے اوپر اٹھتا ہوا پانی اسے صاف دکھائی

دے رہا تھا اور انھیں تیرنے کی سکت نہ تھی۔ ڈوب جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

وہ اپنے پلنگ پر لیٹے لیٹے یونہی کروٹ بدلتا رہا۔ اس کا کمرہ بہت چھوٹا تھا۔ ایک طرف ٹیبل پر چند موٹی موٹی کتابیں رکھی ہوئی تھیں اور ان پر گرد تہہ در تہہ جمی ہوئی تھی۔ جیسے کچی سڑک پر، کتابیں پیدل میلوں کا سفر طے کر کے آئی ہوں اور ستا رہی ہوں۔ کھونٹیوں پر شیروانی اور پاجامہ لٹک رہا تھا۔ پاجامے کی بتنی دہری پر چند مچھر خوابیدہ سے نظر آ رہے تھے۔ ایک لمبے کا بکس دوسرے کونے میں پڑا ہوا تھا۔ اور اس پر نیلے رنگ کا بڑا سا گلاب بنا ہوا تھا، کہیں کہیں سے بکس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ وہ جو دیکھنے میں برص زدہ کٹا ہوا جسم معلوم ہوتا تھا۔ اس کے عمر رسیدہ جوتے۔ وقت کا سرد گرم دیکھ چکنے کے بعد دم بخود بیٹھے تھے، جیسے گنگنا رہے ہوں۔ محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی۔ اور اس کی بے نور آنکھوں کی طرف پھٹی پھٹی بے نور آنکھوں سے تک رہے تھے۔ جوتوں کی آنکھیں، جو مریضوں کی آنکھوں جیسی تھیں، گرد آلود تھیں۔ وہیں پر کنگھی لیٹی ہوئی تھی۔ اور آئینہ دیوار میں لٹک رہا تھا۔ بلکہ وہ آئینہ مرحوم کی یادگار تھا۔ شیشہ ندارد۔ صرف اس کے کٹ کی زرد پشت جھول رہی تھی۔ اگر پورے کمرہ میں کوئی چیز نظر آتی تھی تو وہ تھی ایک گول مٹول سی گھڑی۔ ٹائم پیس کی ٹک ٹک جاری تھی۔ وہ وقت کا بت تھی۔ ایسا بت جو دھڑکتا رہتا تھا اس اسکول ماسٹر کے دل سے زیادہ اور جو اسے ہر وقت بدذاتی رہنے والی ایک بھوتنی نظر آتی تھی ــــــ ایک چڑیل، ایک ڈائن۔

گھڑی بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی، اور وہ دس بجے کا منتظر تھا۔ وہ وقت جو اسے کان پکڑ کر کمرے سے باہر ڈھکیل دے اور پوری سعادت مندی رفتار سے اس کو اسکول کی طرف چلتے رہنے پر مجبور کر دے۔ ابھی بہت دیر تھی۔ لیکن اسے اس وقت کا سخت انتظار تھا۔ شدت کا یہ عالم تھا کہ بعض مرتبہ ساڑھے دس کی انگلیاں اس کے کانوں کے آس پاس سرسراتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ نو بجے سے ساڑھے دس تک کا وقت کاٹنا آسان نہیں تھا۔ یہ روح فرسا وقفہ ایک پھانس کی طرح اس کے دماغ میں اٹکا ہوا تھا۔

وہ لالٹین کی روشنی میں سوچنے لگا۔ اس کے چہرے پر کس قدر گہرے زخم کے نشانات بکھرے ہوئے ہیں گھنے اور بدنما دھبوں سے بکھرے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کس قدر گھن آتی ہے گالوں کی ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں اور آنکھیں بھی مردہ مردہ۔ اسے ایک افیونی یاد آ گیا جس کی بھیگی اور سہمی آنکھیں الٹی الٹی سی رہتی تھیں۔ اور اس کے اسی [illegible] مردہ ثابت کر دیا تھا ــــــ دوسرے افیونیوں نے خوب ماتم کیا، اور سینہ کوٹا ــــــ اور معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ اس کے کفن کا چندہ شروع ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد غسل کے وقت اس کو پلنگ پر [illegible] اس کی آنکھیں اس سے سیدھی ہو گئیں کیچڑ سے لت پت بھیگی اور سہمی آنکھیں! اور اس کی اپنی آنکھیں بھی بدنما تھیں ــــــ اور اسے لگا کہ اس افیونی کی گھناؤنی اڑتی اڑتی پلکیں پھٹکارتی ہوئی آئیں اور اس کی اپنی آنکھوں میں جذب ہو گئیں۔ وہ تلملا گیا۔ جیسے کسی کوڑھی نے اپنے پھوڑے پھنسی، پھٹے پھٹے، لہولہان ہونٹوں سے اس کی آنکھوں کا بوسہ لے لیا ہو۔ یقیناً اس کی آنکھیں اس قدر میلی اور گندی نہیں تھیں۔ اس کے کچھ بال پک چکے تھے، اور وہ کچھ پکارتے رہتے تھے، جیسے دھوپ کے ڈھلنے کا اعلان کر رہے ہوں اور وہ ڈر گیا۔ اس کی عمر بہت دور تک بڑھ آئی تھی، اس بھٹکی ہوئی نہتی فوج کی طرح جو دشمنوں کے علاقے میں غلطی سے داخل ہو جائے ــــــ واقعی دھوپ ڈھل چکی تھی ــــــ تیزی سے ڈھل چلی تھی۔

ایک شروع سے ہی تنگیاں، ہزار مشکلیں اور لاکھ تاریکیاں اس کی زندگی کا حال بنی رہتی تھیں۔ اس زمانے کی بات جب وہ گاؤں کے اسکول میں پڑھتا تھا، اس کے ذہن میں بالکل تازہ تھی۔ جیسے بس کل ہی کی بات تھی۔ وہ اپنے آبائی مکان ــــــ میں رہتا تھا اپنی بیوہ ماں اور بہن کے ساتھ۔ کچھ کاشتکاری چل جاتی تھی، اور کسی نہ کسی طرح کمیوں کی بدولت کفالت

ہوجاتی۔ سب اس کے رحم و کرم موقوف تھا۔ وہ ان دنوں ملیشیا کی قمیص اور اسی کا پاجامہ پہنا کرتا تھا۔ اس کی ماں دیدہ ریزی کرکے کرتے پر بیج دیا کرتی تھی۔ قمیص بالکل سادہ سلتی۔ نہ اس میں کالر ہوتا جسے وہ کتے کے کان سے تشبیہ دیا کرتا تھا۔ اور نہ آستین میں امریکن یا انگریزی کف۔ اور یہ روایت اس کی زندگی میں اب تک زندہ تھی۔

"یار ستیش اپنی پڑھائی چوپٹ کرکے رہے گا۔ یہ پارٹی والی کا کیڑا ابھی دیا ہے۔ ایک بات نہیں سنتا۔ انقلاب، سرخ جھنڈا، سرمایہ دار، مزدور —— ہونہہ"

"تم نے یہ نہیں دیکھا کہ اس کی زندگی میں انقلاب کے لئے جد و جہد سب کچھ ہے۔ کرنے دو اس کو جو کچھ کرے۔ وہ اپنے بنیادی مقصد سے الگ ہوکر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ لیکن ادھر اس کی سرگرمیوں پر کافی دشمن پیدا ہوگئے ہیں۔ اور مجھے تو خطرہ ہے کہیں اس کے چکر میں اسی کا صفایا —— " ریاض کی آواز رک گئی۔ اور کھانسی پھر پھڑانے لگی۔

"اچھا چلو، جلوس میں چلو —— ہم جلوس میں دھنس گئے نہیں۔ کون جانے فضول مصیبت خریدنے۔ کیوں فریدہ"

"ہاں —— ہاں، ہمارا حصہ دور کا جلوہ" "کیوں بیٹا" ہنسنے کی آواز آئی اور پھر دروازہ بند کرنے کی۔ اور پھر وہ بہتے ہوئے، ہنستے ہوئے ... گرد زینوں کے اندر میں غرق ہوگئے۔

اسے من ما کاٹنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک لاش ہے اکڑی ہوئی لاش۔ اور کتے منہ چیر چیر کر اس کے گوشت اور ہڈیوں کو چچوڑ رہے ہیں۔ اور کروٹ بدلتے بدلتے پھر اپنے خیال کی ڈگر پر رواں ہوگیا

اس کا مٹی کا مکان غنیمت تھا۔ گاؤں کی فضا میں سکون تھا۔ آرام تھا۔ خلوص تھا۔ پیار تھا۔ ساون کی جھڑیوں میں بھیگ کر اس کا مٹی کا مکان لیتھ ہو جاتا تو وہ چپ چاپ ایک کونے میں پڑا رہتا گلیاں کیچڑوں سے بھر جاتیں۔ ملک گھناؤنی عفونت اس کی ناک کو چیرنے لگتی۔ بیل، بھینس اور کتوں کا میلا پیلا گاڑھا تیل کی طرح پانی کی سطح پر تیرتا رہتا۔ اور اس کی ماں کانسی کی تھالی میں کھچڑی لاکر دیتی۔ اور وہ بہن کی کابی سے آلو کا بھرتہ اچک لیتا۔ اور وہ چیخ کر ماں کے پاؤں کا کلیجہ دکھا دیتی۔ اور اس کی ماں لجاجت اور خوشامد سے دوڑ کر بھرتہ لے آتی۔ اس کے گالوں کو چمکارتی۔ سہلانے لگتی۔ اور اس وقت وہ بہن سے انتہائی رقابت محسوس کرتا۔ اس کی ماں پھر اصلی گائے کے گھی کی شان میں وہ قصیدہ پڑھتی کہ اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ اور دور تک پھیلے ہوئے جل تھل سبزہ زاروں میں دوڑتے ہوئے وہ جھوم جاتا کہ وہ ان سبزوں اور کیاروں سے تو اچھا ہے، جو بیل، گائے اور بھینسوں کے پیشابوں اور چڑیوں کی بیٹوں سے اٹے بھوسے کے ٹانڈوں میں پڑے رہتے ہیں بدبیاں چھٹیں، اور جب سورج کی چمکتی اور تھرکتی دھوپ میں مٹی کی دیواریں، پھونس کے چھپروں کو لئے دھوپ کھاتی رہتیں تو سوندھی سوندھی خوشبو سے بہت اچھی اور دلپذیر لگتی۔ اور جب وہ اسکول کے راستے پر بڑے سرکار کی حویلی کے پاس سے گزرتا تو دور سے چند گل فام، دہکتی ہوئی لعل لعل لڑکیاں آنکھ مچولی کھیلتی نظر آتیں اور اس کا جی چاہتا، دوڑ کر جائے اور ان کے چہروں پر اپنی دیواروں کی سوندھی خوشبو مل دے، اور آنکھوں میں رنگ برنگ کی، جلی، نیلی پیلی، فالسئی، اودی اودی پیازی تتلیاں پکڑ کر چھپا دے اور پھر دیکھے کیسا لگتا ہے۔ اس کا بے نام بے ارادہ بے سمجھ خیال، بگ خیال خام ابھر ابھر کر ناچتا اور ناچتے ناچتے بھنور بن جاتا جس میں اس کے سپنوں کا محل رقص ناتمام سے فرصت پاکر غرق ہوجاتا —— اس لئے کہ اس کے بے نام ارادوں کے راستے میں ایک بہت اونچی دیوار کھڑی ہوجاتی تھی۔ حویلی چاروں طرف اینٹ اور گارے کے سبز سپر سنتری سے گھیر دی گئی تھی اور اس وقت سے اب تک دیواریں اس کا پیچھا کررہی تھیں۔ یہ دیواریں بھیس بدل کر اس کے خلاف شبخون مارا کرتی تھیں جس طرح گزنیبا سونگ دیوار چین کر ہندوستان کی آزادی پر حملے کرتے رہتا ہے۔ اور جس کا سلسلہ آج بھی دراز ہے۔۔

وہ جھٹ سے اٹھ بیٹھا۔ وہ اب اس خیال سے گریز کرنا چاہتا تھا۔ وہ ان دیواروں کے خوفناک تعاقب سے کتی کترانا

اس نے ایک بھونڈی سی انگڑائی لی۔ جمہائیاں لیں، ناس لیا۔ چٹکیاں ناک میں سڑک سڑک گئیں، تب کہیں چھینکیں نکلیں۔ ناک سے، گدلی غلیظ پھینک کر اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ گھڑی کی طرف اور پھر تکیہ پر اس کی آنکھیں ناچنے لگیں اس نے تکیہ کو الٹ دیا۔ کمبل کو بھی۔ لٹ کر اس نے اس کے نیچے سے خط نکالا۔ زرد لفافہ سے اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے ایک کاغذ کا ٹکڑا نکالا اور اسے پڑھنے لگا۔ مسکرانے کی کوشش میں اس کے ہونٹ پھیلنے لگے۔ اس کی ماں کا خط لرز رہا تھا۔ اور وہ مسکرانے کی جدوجہد میں مبتلا ہو گیا۔

لیکن، پھر جلد ہی اس کی مسکراہٹ ٹمٹما کر ٹھنڈی ہو گئی۔

پندرہ سال کی لڑکی سے شادی کرنے کا تصور کتنا کمینہ تصور تھا۔ فضول، واہیات، انھیں ہو کیا گیا ہے۔ ماں لکھتی ہیں لڑکی سگھڑ ہے۔ ان کی پسند کی ہے۔ عمر صرف پندرہ سال۔ آپ کے پالیس سالہ بچے کے لئے اس سے بہتر جوڑ اور کیا ہو سکتا تھا۔ ان کی آرزوئیں جھوم رہی تھیں، اور یہاں اس تصور سے گھگھی بندھی جا رہی تھی۔ اس کی کمتری کا احساس کانٹوں کی طرح چبھنے لگا اور یہ کانٹے موٹے ہوتے ہوتے ایک دیوار بن گئے۔ وہ کانپ اٹھا۔ اور پریشان نگاہوں سے اس اوٹ کی طرف دیکھنے لگا جس پر کرتا، جالا تن کر آرام فرما رہا تھا   سبز اوٹ پر جالا بہت نمایاں تھا۔ اس اوٹ پر جو سینٹش، تہبند اور ریاض کے کمرے کو اس   سے الگ کرتا تھا۔ اس دیوار کے سینے میں ہزاروں قہقہے چھپے ہوئے تھے، وہ قہقہے جو اس پر ابلے تھے، اور ان سے بھی زیادہ اس دیوار میں اس کا زخم بھی پیوست تھا، اور وہ زخم تھا، سینٹش کا زخم، اس کی ہمدردی، اسے بچانے کا جذبہ اور اس کی دلداری سے اسے بیحد نفرت تھی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

اس کے چہرے سے بے چینی کا مظاہرہ ہو رہا تھا ——— وہ خط کا جواب ضرور دے گا۔ پبلکیشن کی سفارش تنخواہ بڑھ جائے گی۔ اب زیادہ روپیہ ملیگا۔ وہ کسی اور زندگی کا سہارا بھی بن سکیگا۔ اور ایسی صورت میں جواب نہ دینا بہت بڑی بے وقوفی اور بدتمیزی ہوگی۔

ابھی اسے صرف ستر روپیہ ملتے تھے۔ ہر ماہ ستر روپے۔ یہ تنخواہ اسے ایک لاش نظر آتی تھی جو لہروں پر دور سے بہتی ہوئی آتی ہے اور پل بھر میں آگے نکل جاتی ہے ———

وہ دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ اور آگے بڑھ کے زینے نیچے اترتے چلے گئے تھے۔ سیڑھیاں جنھیں وہ روز گنتا تھا، اور اب تو روز اترتے بڑھتے گنتی گنتے رہنے سے سیڑھیوں کی تعداد اسے بالکل زبانی یاد ہو گئی تھی۔ تیرہ تھیں کل۔ جگہ جگہ سیڑھیوں پر سیمنٹ کا پلاسٹر اکھڑ گیا تھا اور چھوٹے چھوٹے سرخ روڑے ابھر آئے تھے۔

درسامنے والی کوٹھی میں مالی پھولوں کی کیاریوں میں پانی پٹا رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی دھوتی کے علاوہ ننگا تھا۔ اس کی پیٹھ پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔ آفتاب کی کرنیں پیٹھ پر چمک رہی تھیں جیسے بھیگی ہوئی بوریاں ندی کے کنارے جال میں چمکتی رہتی ہیں۔ برآمدے میں چند بچیاں کھیل رہی تھیں۔ لکا چوری کھیلتے کھیلتے جب چور پکڑا جاتا بڑے زوروں پر ہنسیں قہقہے ابل پڑتے جیسے شیشے کے گلاس میں کئی چمچے ایک ساتھ ناچ رہے ہوں ——— اور وہیں پر ایک آرام کرسی میں ایک جوان عورت عینک لگائے کوئی اخبار دیکھ رہی تھی۔ اس کے سفید پیر ہل رہے تھے۔ پیہم لرزتے تھے۔ ہونٹوں کے کنارے گہری سرخ رنگ آمیزی تھی ——— جو دور سے ہلکی مسموم ہو رہی تھی، اور کانی آئینوں سے شعاع کی طرح لٹکتی ہوئی بانہیں کرسی کے بازوؤں پر رکھی ہوئی تھیں ——— اس کے دماغ میں پیروں کی سرخ لکیروں کو دیکھ کر خیال ہوا کہ وہ چھوٹے چھوٹے سپنولے تھے جو بیٹھے ہوئے سر پوش رہتے تھے ——— پھر اس کو فوراً یاد آیا کہ کیا بری بات اس نے سوچ ڈالی تھی ———

لیکن وہ تنگ آ رہا تھا۔ مالی دھوپ میں پانی چھڑک رہا تھا۔ وہ پانی چھینٹ رہا تھا۔ دھوپ میں جل رہا تھا تاکہ

کوٹھی میں پھلواریاں ہری بھری رہیں، خوشبوئیں پرواز کرتی رہیں، اور ایک جوان عورت پنکھے کی زد میں بیٹھی بھینی بھینی خوشبو میں بسی رہے، اور پیر ہلا ہلا کر اخبار پڑھتی رہے ــــــ اور اسے محسوس ہوا کہ اس عورت اور مالی کے درمیان بھی ایک دیوار تھی، جو دیکھنے میں نظر نہ آتی تھی۔ اور اس کا جی چاہا کہ بڑھ کر اس دیوار کو توڑ دے۔ مگر اس طرح کی خواہشیں ہمیشہ اس کے سینے میں ایک ایسا تیر بن کر رہ جاتیں جو کبھی کمان سے نہ نکلے ــــــ

وہ شیروانی پہننے لگا۔ اخراجات بہت تھے۔ ستر روپیہ میں بھلا کیا کیا ہو سکتا تھا۔ ماں اور بہن کے لئے گاؤں ہر ماہ تیس روپئے بھیج دیتا تھا۔ بہن کو اس کے شوہر نے طلاق دیدی تھی۔ آوارگی کا الزام لگاتے بوڑھے رجسٹرار کو ذرا شرم نہ آئی۔ اسے نواسی کا غم تھا ــــــ بہرحال ــــــ وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا تھا ــــــ اور وہ پھر اپنے اخراجات پر چلا آیا۔ شہر کا خرچ، کمرے کا کرایہ۔ دھوبی کی دھلائی، حجامت کی بنائی اور دوجنوں چھوٹی بڑی ضرورتیں۔ ایک انار سو بیمار۔ وہ زینوں پر سے اتر کر اپنے مخصوص انداز میں سڑک کے کنارے تحلیل ہونے لگا۔

وہ ــــــ اسکول کی طرف تیز قدموں کے ساتھ چلنے لگا۔ جیسے کچے دھاگے میں بندھا چلا جا رہا ہو ــــ جیسے سکول پہنچتے ہی کوئی شاندار مژدہ سنایا جائیگا۔ ایک آواز اس کے دماغ میں گونج پیدا کر رہی تھی ــــــ جاؤ تمھیں ایک جانفزا پیغام ملیگا۔ تمھیں ہندوستان کی حکومت سونپ دی جائے گی ــــــ جاؤ تمھاری تنخواہ سو روپیہ ہو جائے گی ــــــ اب تم بیوی خرید سکو گے بچے تیار کر سکو گے۔ اپنی نسل دنیا میں پھیلا سکو گے۔ ماں اور بہن کی خدمت کر سکو گے۔ ــــــ بیچارا بیٹا، اچھا بھائی ــــ، اور لاجواب شوہر ــــ یہ تینوں شخصیتیں بیک وقت تمھارے اندر جاگ اٹھیں گی۔ سو روپے کوئی مذاق نہیں ہوتے ــــــ اور اس کے سارے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔

ابھی مسکرایا بھی نہ تھا کہ اس کے چہرے پر گرد جم گئی۔ ایک موٹر فراٹے بھرتی ہوئی نکل گئی۔ جیل کے پاس ایک مارواڑی ایک پولس افسر سے کہہ رہا تھا "مرا کام کر دیجئے ــــــ اور روپیہ، کچھ نہیں بابوجی روپیہ ہاتھ کا میل ہے، سو پچاس، ہزار، پانچ سو میں غریب ہو جاؤں گا کیا ــــــ بابوجی کی بات ہی تو ہے ــــــ" اور وہ آگے نکل گیا۔

اسے اچانک اپنی بیوہ چچی کا خیال آگیا، جن کے یہاں رہ کر وہ تعلیم حاصل کرتا رہا تھا اور جن کے میکے کی آمدنی کافی تھی، اس نے ان کی لڑکی کو پڑھا کر مڈل پاس کرا دیا تھا جس کے عوض میں اس کو کھانا مل جاتا تھا۔ مگر وہ اسے عین خلوص اور محبت سمجھتا رہا تھا۔ بانو بہت پیاری لڑکی تھی، اور اسے امید تھی کہ ــــــ مگر ایسا نہیں ہوا وہ ایک زمیندار صاحب کے لڑکے سے بیاہ دی گئی ــــــ اور شادی کے بعد اس نے خود اپنے کانوں سے بانو کو چہک چہک کر اس کے چہرے کا مذاق اڑاتے سنا، اس کا حسین قہقہہ اسے اس وقت کتنا کریہہ معلوم ہوا تھا۔ جس میں خود اس کے دولہا کے قہقہوں کے بچھو لٹک رہے تھے۔ سر سے پاؤں تک بچھو ڈنک مارتے رہے۔ اور ایک دیوار کھڑی ہو گئی ــ اس کے اور بانو کے درمیان، ــــ اور اسی شام کو وہ اس کمرے میں منتقل ہو گیا ــــ اور از سر نو ہزاروں دیواریں اٹھتی چلی گئیں ــــ سیتش، مہیندرا اور ریاض کے چہرے اس کے دماغ میں در آئے اور نئے بچھو ڈنک مارنے لگے ــــــ لیکن پھر بھی وہ پہاڑی کی طرف نہیں گیا، جہاں اس کی چچی رہتی تھیں ــــ اور جہاں بانو کا نیا دولہا ہر اتوار آیا جایا کرتا تھا ــــــ

اس میں دس سے لے کر چار بجے تک ایک گھنگھناہٹ قائم رہتی تھی اور اسی گھنگھناہٹ نے اسے چونکا دیا، سفید گیٹ کھلا ہوا تھا اور لڑکے برف والے کے ارد گرد بھنبھنا رہے تھے ــــــ وہ اسکول میں داخل ہو گیا۔

ٹیچرز روم میں روزمرہ کی طرح ہماہمی اور گہما گہمی نہیں تھی۔ بلکہ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے چند معززحضرات کسی کی تعزیت پر جمع ہوئے ہوں۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا ــــ

تنخواہ کی بات چل نکلی۔

"ریاض صاحب جنازہ نکل گیا——،

"اچھا——کیوں"

"تنخواہ بڑھی ضرور——مگر وہی اونٹ کے منھ میں زیرہ——اور ادھر مہنگائی بھتہ صاف——" موٹے پنڈت جی بولے جن کے منھ میں پان کا گوبر بھرا ہوا تھا——

اس کا چہرہ فق ہوگیا۔سب کی آنکھیں اس کا چہرہ کریدنے لگیں۔معلوم ہوتا تھا کہ برقی اثر سے اس کے بدن کا ایک ایک قطرہ خون جلا دیا گیا تھا۔اس کے چہرے سے وحشت برسنے لگی۔سب اس کی طرف جھک گئے——

وہ اٹھا، کھڑکی کی طرف گیا۔بلندی سے اس نے کچہری اور دکالت خانہ کا جائزہ لیا۔ہزاروں، فکر اور تردد میں ڈوبے ہوئے، انسان ادھر سے ادھر ہو رہے تھے۔وہ سارے انسان اس کی آنکھوں میں ناچنے لگے اس نے اپنی جیب سے خط نکالا اور اس کے پرزے کر دیئے۔پھر اسکول کی بلندی سے اس نے انہیں زمین پر جانے کے لئے چھوڑ دیا اور ہزاروں، گھائل، فکرمند، اور غم افزا چہروں کی طرح وہ پرزے ناچتے ہوئے، بکھرتے ہوئے، زمین پر پھیل گئے——سو گئے——اور وہ پھر اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔سب ماسٹر خاموش تھے۔اور اس کے سامنے ایک اور سیاہ دیوار اٹھتی چلی گئی——گھنٹی بجی، سکوت ٹوٹا اور سب ماسٹر خاموشی سے اپنے اپنے کلاس کی طرف روانہ ہو گئے——

اس نے بھی اپنے کلاس کا رجسٹر لیا اور کمرے سے نکل گیا۔

جب وہ اپنے کلاس میں گیا تو خاموشی طاری ہو گئی۔اس نے کسی سے آنکھیں نہیں ملائیں ! "لیس سر" کی پتلی، سریلی آوازیں کمرے میں گونجنے لگیں۔بعض دفعہ دوسرے کلاس سے بھی ایک آدھ تیز آواز گونج کر اس کلاس میں بھی ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا کر دیتی——پتلی، سریلی اور کم سن آوازوں کا آہنگ دو تین گدھوں کی آوازوں نے برباد کر دیا،——لیکن وہ مشین کی طرح نام پکارتا رہا۔

اسے جغرافیہ پڑھانا تھا۔مگر وہ گلوب کی طرف خاموشی سے دیکھتا رہا۔اس نے گلوب کو نچا دیا۔گلوب ناچنے لگا اور اسے ہزاروں انسانوں کی طرح پرواز کرتے ہوئے اور بلندی سے گرتے ہوئے خط کے تھکے ہوئے پرزے نظر آنے لگے——اور گلوب کئی پرزوں میں بکھر گیا۔

ایک لڑکے کی طرف اس نے اچانک انگلی اٹھا دی۔وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔اس نے سمجھا قیامت آ گئی۔

"اچھا بتاؤ——" وہ تھوک گھونٹتے ہوئے بولا "زہر کس کو کہتے ہیں۔"

"جی ماسٹر صاحب——جس کو زہر کہتے ہیں۔"

اور پورا کلاس قہقہہ لگا اٹھا۔وہ خاموش ہو گیا۔کرسی پر بیٹھ گیا۔اور بیٹھا بیٹھا انگلیوں کے ٹھوکے سے گلوب کو نچاتا رہا——

گھنٹہ بج گیا۔گھنٹہ بجتا رہا اور وہ ایک کلاس سے دوسرے کلاس کا سفر طے کرتا رہا۔اسی درمیان میں یہ خبر بجلی کی تیزی سے پھیل گئی کہ مزدوروں اور کالج کے لڑکوں کا امن جلوس نکلا تھا۔اس پر شہری گنڈوں نے حملہ کر دیا۔اور کئی آدمی زخمی ہوئے۔اس خبر سے کافی سنسنی پھیل گئی۔لڑکے گھبرا گئے تھے۔ملیٹری گنڈیوں کی عراہٹ سے ان کے چہرے پر اور بھی ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔

لیکن وہ خاموشی سے ایک سے دوسرے کلاس میں جاتا رہا۔ہر پینتالیس منٹ کے بعد۔اور اس کے چہرے

سے ظاہر ہوتا تھا، جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی ـــــ

اسکول کا آخری گھنٹہ تھا۔ گلوب میز پر رکھا ہوا تھا۔ وہ گردش کر رہا تھا۔ لڑکوں کے چہرے سہمے ہوئے تھے۔ اور گلوب کا رقص جاری تھا۔

اس کا چہرہ اور پریشانہ، اور پریشانہ ہو گیا۔

لڑکوں نے گپیں شروع کر دیں۔ شروع میں تو امن جلوس سے گپ شروع ہوئی۔ گنڈوں پر آئی ـــ اور پھر ایک جھٹکے کی اڑان میں گپ آگے بڑھ گئی۔ اشوک کمار، لیلا چٹنس، نینا اور شیام کی گپیں، فٹ بال اور گلی ڈنڈا کی گپیں، دودھ اور حلوائی کی گپیں پھر شکائتیں شروع ہوئیں، ماں کی شکائتیں، باپ کی شکائتیں، پکوڑی والے اور قلفی والے کی شکائتیں اور آخر میں سالے ماسٹروں کی شکائتیں۔

اس کی آنکھیں بلیک بورڈ پر گئیں۔ اس پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا "مرادآبادی برتن ـــ"

وہ مسکرا پڑا۔ اس کے چہرے پر ایک ہلکا سا زندگی کا رنگ پلٹ آیا جیسے اپریشن کے بعد مواد نکل جانے سے آرام ہو جاتا ہے۔ مسکراہٹ کا یہی اثر ہوا۔ آخری گھنٹی بجی۔ ٹن ٹن ٹن۔ بارہ بج گیا۔ افراتفری، یہ جا وہ جا۔ یہ لے وہ دے شہر میں گڑبڑی ہو گئی تھی اس لئے بہتوں کے اپنے رشتہ دار اسکول آ گئے تھے ماسٹروں کو دیر تک ٹھہرنا پڑا اور جب سب لڑکے روانہ ہو گئے تو وہ بھی خراماں خراماں اپنے کمرے کی طرف چلنے لگا۔ بھاری بھاری قدم اٹھاتا ہوا وہ سیدھا گھر نہیں گیا۔ شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس نے کمرے تک پہنچنے میں اتنی دیر کر دی کہ جب وہاں پہنچا تو اسے جاتے ہی بتی جلانی پڑی۔ اسے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ طبیعت کی گرانی کی وجہ سے اس نے دن کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔

پھر بھی وہ اسی طرح لیٹا رہا۔ چاند نکل رہا تھا۔ سامنے کی کوٹھی پر بھی سات آٹھ بتیاں روشن تھیں مالی کا سایہ بھی نظر آتا تھا۔ ریڈیو کے گیت فضا میں تھرا رہے تھے۔

اس کی طبیعت گھبرانے لگی۔ شام سے رات کی طرف وقت روانہ تھا وہ اٹھا اور بغل والے ہوٹل میں جا بیٹھا۔ اسی خاکسار ہوٹل میں وہ کھانا کھاتا تھا۔ وہ میز پر بیٹھا تھا جب اس نے روٹی اور قیمہ کا نوالہ منھ میں رکھا تو اسے ستیش، مہندر اور ریاض یاد آ گئے۔ جن سے چند روز ہی پہلے اسی میز پر مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔ یہ حادثہ تھا اور وہ اس حادثہ سے ڈرتا تھا ـــ

ستیش، مہندر اور ریاض پہلے سے ہی اس ٹیبل پر ڈٹے ہوئے تھے۔ ہوٹل کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کیونکہ قریبی دالس فیکٹری سے مزدور اپنا کام ختم کر کے نکلے تھے اور سب اسی ہوٹل میں دھنس آئے تھے۔

وہ گھبرا کر ادھر ادھر تک رہا تھا۔ کہیں جگہ نہ تھی۔ اور وہ ان لوگوں کے پاس بیٹھنا نہ چاہتا تھا لیکن ستیش نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بغل میں بٹھا لیا تھا۔ اور اس کی یہ حرکت آج تک اس کے گال پر تھپیڑ بن کر چمٹی ہوئی تھی۔ وہ سب ہنستے رہے چٹکیاں لیتے رہے۔ مگر وہ ایک لفظ نہ بولا۔ اس کا گال سرسرانے لگا۔ اور روٹی کا ٹکڑا منھ میں رکھتے ہوئے اس نے اپنا بایاں گال اسی ہاتھ سے سہلایا۔

تینوں کی بحث بھی اسے یاد آ گئی ـــــ

"تم لوگ سامراجی پروپگنڈہ پر زیادہ بھروسہ کرتے ہو" ستیش کہہ رہا تھا۔

"میاں یہ آزادی کا ڈھکوسلہ ہے اینگلو امریکن سرمایہ داری سے سمجھوتہ ہے ـــ تم دیکھو نا ـــ قومی حکومت میں کون لوگ ہیں، کس طبقہ کے نمائندے ـــ قومی حکومت کا مطلب راجواڑوں اور مہاراجاؤں اور ٹاٹاؤں کی حکومت

تو نہیں ـــــ قومی حکومت نے برلا اور ٹاٹا کے گلے میں باہیں حمائل کر دی ہیں ـــــ اور مزدوروں پر کاہلی اور خرابی کا الزام رکھ کر "
وہ کھانا کھاتا جاتا تھا اور باتیں کرتا جاتا تھا۔

اس نے جلدی جلدی زہر مار کیا۔ اور وہاں سے بھاگ آیا۔ پھر کہیں ستیش، مہندر، اور ریاض سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے اور لیکچر بازی شروع نہ ہو جائے

اس نے بتی جلا دی۔ چند لمحوں تک دروازہ پر کھڑا رہا۔ سامنے کوٹھی کی روشنیاں بے حس تھیں۔ ان کی چمک میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ ہمیشہ اسی طرح جلتی رہتی تھیں۔ طوفان آ جائے۔ آندھیاں گذر جائیں، مگر وہ بلب اسی طرح ضوفگن رہتے۔

یکایک بغل والے کمرے سے ایک قہقہے کی آواز آئی اور وہ ڈر گیا۔ دیر تک اوٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر کوئی آواز نہ آئی صرف گھڑی کی ٹک ٹک فضا میں پھیل رہی تھی۔ اسے یہ جان کر صدمہ ہوا کہ بغل والے کمرہ میں کوئی نہیں تھا۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ اسے ایک دھچکا سا لگا۔ ستیش اس پر کبھی نہیں ہنستا تھا۔ لیکن جب کبھی دوسری باتوں پر بھی، اس کا قہقہہ بلند ہوتا تو اسے محسوس ہوتا کہ وہ دیوزاد قہقہہ اسے روند رہا ہے، ـــــ بجتا، پھیلتا، اور امڈتا ہوا قہقہہ۔ اور ایسے میں وہ ایک تھکے ہوئے، ہارے ہوئے، ویران اور جھلسے ہوئے اسکول ماسٹر کی طرح لاش بن کر اپنے کھردرے پلنگ پر گر جاتا۔ اور وہ پلنگ میں ایک لاش کی طرح دھنس گیا

چاروں طرف سے ستیش کے قہقہے دیوار ڈھانے لگے۔ ان قہقہوں میں کتنا تیزاب تھا۔ مہندر، اور ریاض کی کھلی، ننگی گالیوں میں بھی اتنی چھریاں نہ تھیں۔ اگرچہ وہ اس پر کبھی پھبتی نہیں کستا تھا، اور نہ اس پر کبھی ہنستا تھا ـــــ پر اس کے لئے یہ سوال تھا کہ وہ ایک سرے سے ہنستا ہی کیوں تھا۔ ؟

اس کا ذہن گریز کرتا چلا گیا۔

ستیش کو سڑک والی کھڑکی سے وہ کنکھیوں سے دیکھ لیتا تھا۔ وہ کالج سے آکر کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا تھا۔ کبھی اخبار زور زور سے گلا پھاڑ کر پڑھتا تھا۔ اسے اس بات پر بہت غصہ آتا تھا کہ وہ ہمیشہ مزدوروں اور کسانوں کی تحریکوں اور ان کی قربانیوں کی خبریں پڑھا کرتا تھا۔ اس کا اخبار بھی نرالا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ اسے کچہری روڈ پر پارٹی کا اخبار بیچتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ پتہ نہیں وہ آدمی تھا یا مشین، یا سامنے والی کوٹھی کا بلب، جو ہر وقت جلتا رہتا تھا، مسکراتا رہتا تھا۔ اس مسکراہٹ مالی کے آب پاش سے گرتے ہوئے ٹھنڈے پانی کی کلیلوں کی طرح تھی۔ پھر بھی ستیش کو دیکھ کر خواہ مخواہ اس میں نفرت جلن اور غصہ کے جذبات ابھرتے تھے۔ لیکن وہ مسکراتا رہتا۔ اس کی برافروختہ نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر مسکراتا۔ جس طرح دھوپ سے جلتی ہوئی دھرتی پر مالی پانی چھڑکاؤ کرتا رہتا تھا۔ اس نے کئی بار، مختلف حالات اور مختلف جگہوں میں اسے دیکھا تھا۔ اور ہر جگہ، ہر حال میں اس کی مسکراہٹ کی شفق کھلتی نظر آتی تھی۔ مخصوص تبسم، اوپر کا لب پھیلا ہوا اور نچلا ہونٹ لرزاں ترساں جس میں شاداب مسکراہٹ پنہاں رہتی۔ بس مسکرائے جا رہا ہے۔ چل رہا ہے تو، پڑھ رہا ہے تو، گپیں ہانک رہا ہے تو، کسی موڑ پر ہو، کسی بھی خیال میں، اس کے پتلے ہونٹوں میں مسکراہٹ پروئی ہوتی تھی۔ جیسے دھاگے میں پھول۔ ستیش کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں اور بھی خون اتر آتا جب وہ اپنے، گندمی گرد آلود چہرے، الجھے ہوئے خشک خاک آلود بال، میلی قمیص اور گندہ پاجامہ اور موٹر کے ٹائر کی کفائتی چپل سے چھین کر مسکراہٹ کی چاندنی کا ہاتھ بڑھتا اور اس کے چیچک زدہ چہرے پر تھپڑ لگا جاتا۔

ایک روز اس کی یہ دبی ہوئی خواہش پوری ہوتی ہوتی رہ گئی۔ اور اسے محسوس ہوا کہ ایک لہر ساحل تک پہنچنے سے قبل ہی لوٹ گئی۔

دیر تک باہر رہ کر ستیش رات کے وقت کمرے میں پہنچا۔ وہ کاپیوں پر جھکا ہوا تھا۔ نمبر دیئے جا رہا تھا۔ آنکھیں بوجھل

ہوئی جا رہی تھیں کہ آواز آئی۔ گرجتی ہوئی ڈانٹ۔ اور اس کی اُمید پوری ہونے والی تھی۔ اس کے انتقامی جذبے نے ایک پھریری لی۔ آواز مسلسل بڑھ رہی تھی۔

"شرم نہیں آتی آوارگی کرتے ہو۔ بیچارے بیوں کی مصیبت میں کیا کام آئے اور گندگی نچوڑنے لگے۔ تمہاری دوستی پر شرم آتی ہے —— کیا چاہتے ہو کہ اس کمرے سے بھاگ جاؤں ——" اور جب اس نے جھانک کر دیکھا تو ایک شلوار تاریکیوں میں لہرا کر دھندلی ہوتی چلی گئی۔ اور اس کی سانسوں کا وزن اچانک ہزار گنا بڑھ گیا جیسے روئی پر پانی ڈال دیا گیا ہو۔

پہلی مرتبہ اس نے ستیش کی طرف —— سنجیدگی سے دیکھا تھا۔ اور اسے کچھ نظر آیا تھا اس کی شخصیت کے پیچھے —— اس کا راسخ عقیدہ تھا کہ ستیش کمینہ ہے۔ ریاض اور مہندر پھر بھی کم کمینے تھے۔ ستیش کے قہقہے میں اسے آتش فشاں گولیوں کی آواز سنائی دیتی تھی، جو اس کے سینے میں، اس کی روح میں اترتی چلی جاتی تھیں۔ وہ اس سے نفرت کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا —— لیکن اس رات ستیش اس کے ذہن پر چھایا جا رہا تھا —— اپنے ہونٹوں پر بکھرے ہوئے کانٹوں سے مسلح۔ اور اس کی اُمید پوری نہ ہوئی۔ اس کا انتقام سو گیا۔ مہندر اور ریاض کی مردانگی مر گئی تھی، اور انھیں سانپ سونگھ گیا تھا۔

اس کی آنکھیں گھڑی کا طواف کرنے لگیں۔ گھڑی جو وقت کا بت تھی۔ ڈائن منتر پڑھتی ہوئی جادوگرنی، جو ہر وقت کا کلیجہ چباتی رہتی ہے۔ ہر ٹِک کے ساتھ اس کی چالیس سالہ عمر پر ایک اور خراش کھنچ جاتی ہے۔ اس کے ماتھے کی شکنوں میں مسلسل اور متواتر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ شکن شکن نہیں تھی، دیوار تھی۔ اس کی زندگی کا تعاقب کرتی ہوئی دیوار۔ اور وہ صراحی سے انڈیل کر پانی پینے لگا، ایک گلاس، دو گلاس، تین گلاس۔ اس کی آنکھیں گرستہ، اور گرستہ ہو گئیں۔ اس کے ہونٹوں کی جلن اور بڑھ گئی۔ چالیس سالہ اسکول ماسٹر —— اور پندرہ سالہ لڑکی۔ خوب، خوب —— ماں، بہن، باؤ، چیچک —— پندرہ سالہ حسن۔ لطیف اور نرم جوانی اور چالیس سالہ جوان اسکول ماسٹر —— خوب، خوب اور اس نے اور پانی پینا چاہا۔ صراحی خالی ہو گئی۔ اور اس کا گلاس صرف آدھا بھر سکا۔ اور اس نے اسے بھی منھ میں انڈیل لیا۔ اور پھر ٹھنڈے گلاس کو اپنے گال پر رگڑنے لگا۔ ہلکے ہلکے ——

حکومت کی پروپیگنڈہ گاڑی کرفیو کا اعلان کرتی جا رہی تھی۔ زینوں پر آہٹ ہوئی اور دو سائے کمرے کی طرف بڑھ گئے ——

دوبارہ وہ پلنگ پر گر گیا۔ اس کے خیالات میں کوئی ہمواری نہیں تھی، کوئی اُمنگ نہیں تھی، کوئی سجاوٹ نہیں تھی —— پر وہ طرح طرح کی باتیں سوچتا جا رہا تھا۔

اچانک اسے کسی چیز کی محسوس ہوئی۔ اور وہ اُٹھ بیٹھا۔ اور غور سے سننے کی کوشش کرنے لگا۔ گویا اس کے کانوں میں اسٹیتھسکوپ لگا ہوا تھا، جس کا دوسرا سرا کسی مریض کی چھاتی پر چپکا ہوا تھا۔ لیکن اسے کوئی آواز سنائی نہ دی اس نے اوٹ کے اس پار دیکھنا چاہا، مگر وہاں بالکل اندھیرا تھا، کوئی روشنی نہ تھی۔ نہ کوئی آواز ہی آئی۔ یہ بالکل نئی بات تھی۔ اس کا پڑوسی کمرہ کبھی بھی اتنا مردہ، اتنا سست اور خاموش نہیں رہا تھا۔ تھکا تھکا۔ بالکل مفلوج۔ نہ مہندر اور ریاض کی گالیاں تھیں، اور نہ ستیش کے قہقہے۔ حالانکہ کمرہ کھل چکا تھا۔ پاؤں کی آہٹ اور زنجیروں کی جھنکار صاف سنائی دی تھی ——

وہ دروازہ پر کھڑا ہو گیا۔ سامنے کی کوٹھی میں بدستور دیوالی تھی۔ بلب جگمگا رہے تھے۔ بچے کھیل رہے تھے دھندلے دھندلے پھولوں کے درخت جل رہے تھے، اس میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ اور ریڈیو کی لہراتی ہوئی موسیقی فضا میں رقصاں تھی۔ کتے بھونک رہے تھے اور اس کے اپنے دماغ میں بہت سے کتے بھونکنے لگے تھے۔

زندگی میں پہلی بار اس کے پیر خودبخود بغل والے کمرے کے دروازے کی طرف اٹھ گئے۔ کوئی ناقابل شکست طاقت اُسے کھینچے لئے جا رہی تھی۔ اسے ان تینوں سے نفرت تھی۔ اور اسے ستیش سے تو نفرت سے بڑھی ہوئی نفرت تھی۔ پھر دیواریں کیوں نہیں جھنجھنائیں؟ گالیاں کیوں نہیں جھپٹیں؟ قہقہے، ستیش کے دبیح اور بیباک قہقہے کیوں نہیں اُمڈے؟ کیوں نہیں پھیلے؟ ہر چیز کو حقارت سے مٹتے دلتے ہوئے——؟

وہ دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ سڑک کی برقی روشنی کے مدھم عکس میں دو سائے نزدیک نزدیک ایک ہی پلنگ پر بیٹھے نظر آئے۔ خاموش، بالکل بت کی طرح۔ اس نے صاف پہچان لیا—— کھونٹی پر ستیش کی نیلی پتلون لٹک رہی تھی جو اس وقت بالکل سیاہ نظر آ رہی تھی۔

اس کا بدن سنسنا رہا تھا۔ وہ اور قریب گیا۔ اس کے دماغ میں کیتلی کی کھولتی ہوئی سنسناہٹ تھی۔ اسے دو دھندلے سایوں میں ایک اور دھندلے سائے کی تلاش تھی جسے وہ خود بھی نہیں جانتا تھا—— کہ آخر کیوں؟——

اندھیرے میں بہت سے پھانسی کے پھندے اس کی گردن کی طرف لپکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اور وہ ڈگمگیا، ذرا سا ڈر گیا۔ کون تھکانا دونوں آسیبی سائے ہوں دور سے پروپیگنڈہ وان کی چیخیں اس کے کانوں میں چھلا رہی تھیں۔ لیکن فوراً ہی دروازے سے پلٹ کر اس نے دیکھا—— اسے جگمگاتی ہوئی کوٹھی نظر آئی۔ اور اس نے اپنے دل کو سنبھالا لیا——

وہ چاہتا تھا کہ وہ خاموش سائے، وہ چپ بت بولیں، کچھ بولیں۔ مگر اندھیرا بڑھتا گیا۔ اس کی آنکھوں کے افق پر ڈراونے سائے جھومنے لگے۔ اس کا خوف بڑھتا گیا۔ اس کے حلق میں کانٹے بھی پڑنے لگے—— اور وہ بالکل محبوس سا ہو گیا۔ خوفناک اندیشوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا۔ وہ چیخ مار کر چلنے والا ہی تھا کہ ایک ہانپتی ہوئی آواز نے بڑھ کر اسے جکڑ لیا——

"جانتا ہوں ماسٹر صاحب آپ کو ستیش کے قہقہوں سے نفرت تھی، اس کے قہقہوں سے سب کو نفرت تھی، خود ہمیں نفرت تھی۔—— لیکن وہ قہقہہ اب سنائی نہ دیگا۔ اب آپ اس قہقہے سے نفرت نہیں کر سکیں گے۔ اس کے قہقہے کو چاقو نے کاٹ کر رکھ دیا ہے—— اور ماسٹر صاحب——"

اور وہ اپنے کمرے میں بھاگ آیا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ایک روشنی کا طوفان دوڑ رہا تھا۔ اس کو محصور رکھنے والی دیواریں ڈھے رہی تھیں۔ اور اس کے کمرے کی تابناک روشنی دوسرے کمرے کی تاریکی میں گھل رہی تھی۔ اور اس کو محسوس ہوا جیسے روشنی کے سیلاب میں بہتی ہوئی دیوار کے ساتھ ایک لاش تنکے کی طرح بہتی ہوئی جا رہی تھی، جس کے سینے کے زخم سے پھوٹتی ہوئی شفق میں ایک ان ہار قہقہہ ناچ رہا تھا۔

(انجمن ترقی پسند مصنفین گیا میں پڑھا گیا)

عزیز عرفی

جنون

کمرہ ۲۲
کونٹی نینٹل ہوٹل
۱۵ جون ۱۹۴۸ء

ڈیر نیلسن!

میں کل بذریعہ ہوائی جہاز یہاں پہونچا۔ کل بہت زیادہ تھکا ہوا تھا جس کی بناء پر تمھیں خط نہ لکھ سکا آج صبح ہی فیلڈن آگیا اور اُس کے ساتھ میں تمام کلکتہ کی سیر کرتا رہا۔ دوپہر کا کھانا فیلڈن کے مکان پر کھایا۔ اور شام کی چائے بھی ایک ہوٹل میں پی۔ اس وقت رات کے بارہ بجے ہیں۔ تمام شہر پر خاموشی اور ظلمت کا دور ہے۔ لیکن کہیں کہیں عمارتوں میں روشنی نظر آجاتی ہے۔ میرے برابر والے کمرے میں شور و شغب ہو رہا ہے اکثر چھن چھنا چھن کی آوازیں بھی آجاتی ہیں۔ شاید ہندوستانی رقص ہو رہا ہے طبیعت میری بھی چاہتی ہے کہ اس سے لطف اندوز ہوں لیکن میں یہاں ایک اجنبی ہوں۔

نیلسن! کلکتہ ہندوستان کا سب سے بڑا اور سب سے خوبصورت شہر ہے۔ کلکتہ میں وہ پیرس اور لندن کی سی رعنائی اور خوبصورتی تو نہیں ہے لیکن پھر بھی کلکتہ یورپ کے اکثر مشہور شہروں سے زیادہ حسین ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ بھی یورپ کا ایک شہر ہے۔ آج صبح جب میں یہاں کے پارکوں، بازاروں اور دیگر تفریح گاہوں میں گیا تو مجھے یہ دیکھکر حیرت ہوئی کہ ہندوستانی بھی اس قدر مہذب ہوسکتے ہیں۔ لیکن ذرا صفائی پسند نہیں۔

شام کو فیلڈن مجھے سمندر کے ساحل پر لے گیا بہت ہی زیادہ روح پرور نظارہ تھا مجھے ایسا معلوم ہوا میں مشرقی انگلینڈ کے ساحل پر بیٹھا انجیلا سے باتیں کر رہا ہوں اور میری انجیلا.......

اور پھر میری آنکھوں میں ماضی کی رنگین داستان جھلملانے لگی۔ میں بہت دیر تک انجیلا کی سی آنکھوں جیسے نیلے سمندر کو دیکھتا رہا ــــ تم کہو گے میں پھر انجیلا کا ذکر لے بیٹھا ــــ ذرا غور کرو۔ اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا تمھارا دل قرقت کے آنسو نہ بہاتا؟ ــــ اُس نے میرے ساتھ بے وفائی کی ــــ ہاں ــــ لیکن ــــ

نیلسن! اس کی بے وفائی میری محبت تو ختم نہیں کرسکتی ــــ خیر چھوڑو اس ذکر کو۔ تمھیں کوفت ہو رہی ہے۔ ہاں تو پھر جب سورج ساحل پر اُگے ہوئے ناریل کے درختوں کے عقب میں غروب ہوگیا۔ تو ہم لوگ بھی اپنی جائے قیام کی طرف روانہ ہوگئے۔ راہ میں بہت سے عجیب ہندوستانی نظر آئے۔ جن کے جسم پر ایک گز کپڑے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ جن کی پسلیاں بہ آسانی شمار کی جاسکتی تھیں۔ ننگے سر ــــ بالوں سے محروم، سر خاک آلود میلے کچیلے۔ جو تیز تیز قدم اٹھائے آبادی کی طرف سے آرہے تھے۔ فیلڈن نے مجھے بتایا کہ یہ یہاں کے مزدور ہیں جو کہ تمام دن شہر میں مزدوری کرتے ہیں۔ اور شام کو اپنے اپنے گاؤں چلے جاتے ہیں۔ ہم جوں ہی شہر میں داخل ہوئے تو ایک اور نئی مخلوق سے واسطہ پڑا۔ دن میں تو یہ بہت کم ہی نظر آئے تھے لیکن اس وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے ٹپک پڑے ہیں یا زمین نے اُگل دیئے ہیں ان کی حالت اور بھی زیادہ خستہ اور ناقابل دید تھی۔ ننگے، بھوکے، بلبلاتے ہوئے ہوٹلوں کے دروازوں

پرکتوں کی طرح لڑتے ہوئے۔ انسانیت کو اس روپ میں دیکھ کر میری روح لرز گئی۔ جب یہ کسی سے سوال کرتے تو اس وقت پیچھا نہ چھوڑتے جب تک وہ ایک تھپڑ نہ لگا دے یا ایک سکہ ان کے نیم مردہ اور خاک آلود ہاتھوں پر نہ رکھ دے۔ میں نے متعدد مہذب ہندوستانیوں کو دیکھا، جو کہ اس مخلوق کو مارتے ڈھکیلتے آگے بڑھ جاتے تھے۔ اُف! کس قدر تذلیل ہے انسانیت کی۔ شاید یہ طبقہ انسانیت سے خارج ہے۔ انسان نما مخلوق ہے لیکن انسان نہیں۔

اچھا نیلسن! اب وقت کافی ہو چکا ہے۔ برابر والے کمرہ کی چھنا چھن بھی ختم ہو چکی ہے۔ اگر ممکن ہو تو ایک سیاح کا سلام اینجیلا تک پہونچا دینا جو اپنے ملک سے ہزاروں میل دور سیاحی کے شوق میں کسی کے غم کو بھولنے کی کوشش کر رہا ہے دعا کرو یسوع مسیح اس کی مدد کرے۔ خدا حافظ

بدنصیب
سی۔ کے۔ میتھیو۔

——— ۲ ———

کمرہ نمبر ۲۴　　　　۱۵ جون ۱۹۴۷ء
کونٹی نینٹل ہوٹل

ڈیر نیلسن!

پرسوں رات میں یہاں کے ایک لیڈر کے ہاں کھانے پر مدعو تھا۔ میرے علاوہ شہر کے رؤساء اور بڑے بڑے آفیسر بھی مدعو تھے۔ کھانے کے بعد مے نوشی اور ہندوستانی رقص کا دور شروع ہوا۔ شراب تو میرے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی۔ وہی جن اور وائٹ ہارس کی بوتلیں حاضرین محفل کو حیات نو بخش رہی تھیں۔ لیکن ہاں ہندوستانی رقص ضرور میرے لئے ایک عجیب اور دلچسپ چیز تھا۔ کیونکہ مجھے ہندوستانی رقص دیکھنے کا اشتیاق تھا۔

نیلسن! میں نے دوران سیاحت میں افریقہ کے نیگروں کا بھی رقص دیکھا تھا۔ جاپانیوں کے رقص سے بھی محظوظ ہوا ہوں، اور چینیوں کے رقص سے بھرپور ڈرامے بھی دیکھے ہیں اور پرسوں رات ہندوستانی رقص بھی دیکھا ہے۔ واقعی دلچسپ اور بہت عمدہ تھا۔ لیکن منی پور کے رقص کی سی بات نہ تھی۔ رقاصہ کلکتہ کی ایک مشہور طوائف تھی۔

ہندوستانی رقص میں دو خوبیاں ہوتی ہیں۔ پہلی خوبی یہ ہے کہ رقاصہ اپنے اعضاء اور اشاروں کی مدد سے کوئی داستان کہتی ہے یا واقعہ بیان کرتی ہے۔ اس خوبی سے تو صرف وہی لوگ محظوظ ہوتے ہیں جو اس فن سے واقفیت رکھتے ہیں دوسری خوبی یہ ہے کہ رقاصہ اپنے رقص کے ذریعہ ناظرین پر ایک ایسا سحر پھونکتی ہے کہ ناظرین پر بے خودی طاری ہو جاتی ہے اور جھومنے لگتے ہیں۔ لیکن اوّل الذکر صفت خاص ہے اور وہی اصل رقص تصور کی جاتی ہے۔ تو پھر تم سمجھو نیلسن میں تو بالکل ایک اجنبی تھا۔ لیکن میرے میزبان نے اور فیلڈن نے (کیونکہ وہ اس میں کافی دخل رکھتا ہے) میری رہنمائی کی جس کی بنا پر مجھے ہندوستانی رقص سے محظوظ ہونے میں کافی مدد ملی۔

رات کے تقریباً گیارہ بجے تھے۔ رقص اپنے شباب پر تھا۔ بوتلیں پر بوتلیں خالی ہو رہی تھیں۔ تمام فضا پر رومانیت طاری تھی کہ دفعتاً مکان سے باہر ایک شور بلند ہوا اور پھر گولی چلنے کی مسلسل آوازیں۔ رقص ختم ہو گیا حاضرین نے ایک دوسرے کی طرف حیرت اور پریشان نگاہوں سے دیکھا اتنے میں ایک ملازم آیا۔ ہانپتا اور لرزتا ہوا ہوش و حواس سے محروم۔ اور وہ بمشکل اس قدر کہہ سکا "ہندو مسلم فساد"! ملازم کی اس قدر پریشان کن اور عجیب حالت دیکھ کر

میرے جسم میں بھی سنسناہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ حاضرین کے متحیر چہرے اپنی سابقہ حالت میں مبدل ہو چکے ہیں تو مجھے یک گونہ تسکین ہوئی۔ میں نے اپنے میزبان سے اس بارے میں دریافت کیا تو اس نے انتہائی بے پروائی سے جواب دیا۔ "کچھ نہیں شہر کے کچھ غنڈے ہیں کمبخت لڑ بیٹھے ہیں"۔ اور پھر ہر طرف سے "ہندو مسلم فساد"، "ہندو مسلم فساد" کا شور بلند ہونے لگا۔ کمبخت کہیں کے۔ باقی تمام لوگوں نے اس پر قہقہے بلند کئے۔ غرض محفل کی کھوئی ہوئی رونق پھر واپس آگئی۔ رقص شروع ہو گیا۔ پھر جن اور وائٹ ہارس کی بوتلیں حاضرین کو مسرت و شادمانی کیف ومستی بخشنے لگیں۔ رقص ہوتا رہا۔ شب گذرتی رہی۔ تقریباً چھ بجے رقص ختم ہوا۔ رقاصہ بھی تھک کر چور ہو چکی تھی۔ اور ہم لوگ بھی شب بیداری کی وجہ سے نڈھال ہو چکے تھے۔ شب ہندو مسلم فساد ہونے کی وجہ سے کرفیو کا نفاذ عمل میں آ چکا تھا۔ لہٰذا حاضرین کو اپنے اپنے مکانوں تک پہنچنا ناممکن تھا۔ مہمانوں میں ایک صاحب مقامی حکومت کے رکن خصوصی بھی تھے اُن کی وجہ سے ہم لوگوں کو مخصوص پروانہ راہ داری مل گئے اور میں تقریباً آٹھ بجے وہاں سے اپنی جائے قیام کے لئے روانہ ہو گیا۔

نیلسن! میں نے راہ میں کیا دیکھا؟۔ اُف لکھتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ اس کے تصور سے میری آنکھوں میں دھند چھانے لگتا ہے۔ میرا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے اور میں سوچتا ہوں "کیا ہندوستانی اب بھی آج سے ہزاروں سال پہلے کی سی جنگلی قومیں ہیں جو کہ اپنی پیاس اپنی ہم جنس کے خون سے بجھایا کرتی تھیں۔ تم ہی فیصلہ کرو۔۔۔

ـــــ جب ہماری کار ایک تنگ راستہ سے گذرنے کے بعد سڑک پر آئی تو ہمیں اپنی کار سے اترنا پڑا۔ آگے راستہ دشوار تھا۔ معلوم ہے، کیوں۔ سڑک مردہ جسموں سے پٹی ہوئی تھی۔ اور خون اس طرح پڑا ہوا تھا جیسے خون کی بارش ہوئی ہو۔ اُف میری آنکھوں سے ایسا روح فرسا منظر نہ دیکھا گیا۔ اور ہم لوگوں نے واپس ہونا ہی بہتر سمجھا۔ لیکن ایک پولس آفیسر جو سکاٹ لینڈ کا رہنے والا ہے ہمارے قریب آیا اور ہم لوگوں سے کچھ سوالات کرنے کے بعد اس نے چند سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ جلد سے جلد ہمارے لئے راستہ صاف کر دیں۔ سپاہیوں نے جلدی جلدی مردہ اور سسکتے ہوئے جسموں کو نالیوں کی طرف گھسیٹنا شروع کیا۔ اور تقریباً پندرہ منٹ میں ہمارے لئے ایک مختصر سا راستہ نکل آیا۔ اور ہم لوگ انسان کے لہو کو روندتے ہوئے وہاں سے گذر سکے۔

نیلسن! ان مرنے اور سسکنے والوں میں زیادہ تر ہندوستان کا وہ طبقہ تھا جو روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کے لئے کتوں کی طرح لڑتا ہے اور جو دن بھر مزدوری کرنے کے بعد بھی ننگا اور بھوکا رہتا ہے اور ان کے جان لیوا خون آشام درندے شاید وہ مہذب ہندوستانی تھے جو اپنی فلک بوس عمارتوں میں دروازے مقفل کئے اس وقت شاید اپنے ریڈیو سیٹ کے قریب موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

نیلسن! میں آج ہی بذریعہ ہوائی جہاز دہلی جا رہا ہوں۔ کلکتہ انسانوں کی جگہ نہیں۔ حیوانوں کی بستی ہے۔ اگر ممکن ہو سکے تو انجیلا تک میرا سلام شوق پہونچا دینا۔ خدا حافظ۔

تمہارا
سی۔ کے۔ میتھو

—— ۳ ——

امپیریل ہوٹل
نئی دہلی
یکم جولائی ۱۹۴۷ء

ڈیر نیلسن! کلکتہ کی خونی فضا سے نکل کر جب میں نے دہلی میں قدم رکھا تو میرے دل کو سکون اور اطمینان سا

محسوس ہوا۔ جیسے کہ درندوں کی بستی سے نکل کر انسانوں کی دنیا میں آگیا ہوں۔ اور اب بھی جب مجھے اس خونی فضا کا خیال آجاتا ہے تو ہر ہندوستانی سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ شاید ہر ہندوستانی کلکتہ کے باشندوں کی طرح نہ ہو ————

یہاں دہلی کے دو شہر ہیں۔ پرانی دہلی۔ ہندوستان کی قدیم سلطنت کا دارالخلافہ۔ نئی دہلی۔ موجودہ حکومت کا صدر مقام۔ پرانی دہلی کی زیادہ تر معاشرت اور تہذیب پرانی ہے اور نئی دہلی کی تہذیب اور معاشرت، مغربیت سے متاثر نظر آتی ہے۔ دونوں شہروں کے درمیان تقریباً چار پانچ میل کا فاصلہ ہے۔ جس کی وجہ سے آمد و رفت میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی۔ میں یہاں سنیچر کی صبح کو آگیا تھا۔ اتوار کی صبح۔ ہوٹل کے منیجر کے ہمراہ چرچ گیا۔ وہاں جولیا سے ملاقات ہوگئی۔ وہ یہاں اپنے شوہر کے ساتھ ہے۔ اس کا شوہر حکومتِ ہند کے ایک شعبہ کا سکریٹری ہے۔ نیلسن! وہ پہلی سی قدیم خندہ پیشانی سے ملی۔ میرے دل کو ایک لمحہ کے لئے مسرت تو ضرور ہوئی لیکن کوئی خاص نہیں کیونکہ اسے دیکھتے ہی میرے دل میں انجیلا کی یاد چٹکیاں لینے لگی۔ جس کی بناء پر میرے اوپر ایک عجیب قسم کا اضطراب چھا گیا لیکن میں نے پھر بھی اپنی بگڑتی حالت پر جلد ہی قابو پا لیا اور خوش خلقی کا دامن آخر تک تھامے ہی رہا۔ اس نے مجھ سے دورانِ گفتگو میں کہا "شاید آپ کو اب تو میرے ساتھ رہنے اور بات کرنے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔" نیلسن! میں اس کے اس جملے سے قدرے شرمندہ ہوگیا اور میری نگاہیں خود بخود زمین کی طرف جھک گئیں۔ لیکن نیلسن تم ہی بتاؤ اس میں میرا کیا قصور۔ یہ ٹھیک ہے کہ کبھی میرے اور اس کے تعلقات انتہائی خوشگوار تھے لیکن کبھی میں نے اس کے سامنے اظہارِ محبت تو نہیں کیا۔ میں ہمیشہ انجیلا سے محبت کرتا رہا [illegible] اگرچہ جولیا مجھ سے محبت کرتی تو وہ میرے سامنے اس کا ظاہری طور پر اظہار نہ کر سکتی اگر کرتی تو [illegible] پوشیدہ [illegible] میں انجیلا کی محبت میں اس قدر مدہوش تھا کہ میں خود بھی جولیا کو نہ سمجھ سکا۔ لہٰذا اس سے میرا انکار کرنا بے ظلم نہ تھا۔

اس نے مجھ سے انجیلا کے متعلق کچھ نہ پوچھا جواب پر کہ بہت افسردہ ہوئی۔ کہنے لگی "کاش تم بھی مسرت کی زندگی بسر کر سکتے" اس وقت اس کے زرد اور ہڈیاں ابھرے ہوئے چہرے کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ نیلسن! جولیا اب وہ پہلی سی جولیا نہیں۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ افسردہ ہو چکی ہے اس کی آنکھوں کی دلکشی معدوم ہو چکی ہے اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی ہیں۔ اب وہ دو بچوں کی ماں ہے۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے اس نے بہت اصرار کیا کہ بجائے ہوٹل کے میں اس کے یہاں رہوں۔ اول تو یہ میرے اصول کے خلاف تھا دوسرے میں نے کچھ بہتر بھی نہ سمجھا۔ وہ روز صبح ہوٹل آتی ہے اور پھر میں اس کے ہمراہ سیر کے لئے جاتا ہوں۔

کل ہم لوگ لال قلعہ دیکھنے گئے اسے یہاں کی عمارات میں خاص اہمیت حاصل ہے یہ ایک مغل بادشاہ شاہجہاں کا بنوایا ہوا ہے۔ اس بادشاہ کو عمارتیں بنوانے کا بہت زیادہ شوق تھا۔ اس نے یہاں متعدد اور لاثانی عمارتیں تعمیر کرائی ہیں۔ جن میں لال قلعہ اور تاج محل قابلِ دید اور قابلِ ذکر ہیں۔ تاج محل کا شاید تم نے بھی نام سنا ہو۔ سات عجائباتِ عالم میں سے یہ بھی ایک ہے۔ یہ یہاں کے ایک شہر آگرہ میں بنا ہوا ہے۔ ارادہ ہے کہ ضرور جاؤں گا۔

نیلسن! لال قلعہ مکمل سرخ پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ اور انتہائی شاندار۔ اس کے دیوانِ عام اور دیوانِ خاص قابلِ دید ہیں۔ بادشاہ اور اس کی ملکہ کے کمرے اور موسمِ گرما اور سرما کے غسل خانے تعمیر کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ جن کے درمیان سے ایک چھوٹی سی مرمریں نہر گذاری گئی ہے کہا جاتا ہے کہ اس نہر میں پانی دریائے جمنا سے آتا تھا دیواروں کی نقاشی انتہائی حیرت کن ہے۔ تین سو سال گذرنے پر بھی اس کی آب و تاب برقرار ہے مجھے تعجب ہوتا ہے کہ

آج سے تین سو سال قبل ہندوستانی فن تعمیر اور فن ہندسی کے اس قدر محدود نظریات تھے۔ قلعہ کے اندر ہی موجودہ حکومت کا بنوایا ہوا ایک عجائب خانہ ہے۔ جس میں عہد قدیم کے اسلحہ جات اور تاریخی نوادرات کا ذخیرہ ہندوستان موجود ہے۔ ان چیزوں سے اس زمانہ کی تہذیب پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ کاش تم میرے ساتھ ہوتے نیلسن

آج جولیا نے قطب مینار دیکھنے کا پروگرام بنایا ہے۔ کل صبح روانہ ہو جائیں گے یہ دہلی سے تقریباً گیارہ میل کے فاصلہ پر ہے اس مینار کو بھی عجائبات عالم میں اس کی بلندی کی وجہ سے شمار کیا جاتا ہے اسے ایک مسلمان بادشاہ نے بنوایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک مسجد بنوانا چاہتا تھا جس کے چار میناروں میں سے ایک یہ اس نے تعمیر کرایا لیکن پھر حالات سازگار نہ رہے اور اس کی آرزو تشنۂ تکمیل رہ گئی۔ جولیا نے بتایا کہ دست درازیٔ زمانہ کے ہاتھوں اس کی بالائی دو منزلیں گر چکی ہیں لیکن پھر بھی وہ انتہائی بلند ہے اور اسی بلندی کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت حاصل ہے ——

اچھا نیلسن! خط بھی کافی طویل ہو چکا ہے اور رات بھی بھیگ چکی ہے لہذا باقی آئندہ ....

تم کہو گے میں نے جولیا کی قربت میں انجیلا کو فراموش کر دیا ہو گا۔ نہیں۔ اس کی یاد مجھے بہت زیادہ پریشان کرتی ہے اور میں جب بھی جولیا کو دیکھتا ہوں، تو اس کا مسکراتا ہوا چہرہ میری نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور میرے اوپر عجیب وحشت طاری ہو جاتی ہے میرا جسم مرتعش ہو جاتا ہے میری آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے تیرنے لگتے ہیں جس سے جولیا کو کافی تکلیف ہوتی ہے اور پھر مجھے اس کے سامنے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔

نیلسن! اگر ممکن ہو تو انجیلا کی ایک تازہ تصویر روانہ کر دو۔

اچھا خدا حافظ

——— ۴ ———

کمرہ نمبر ۳۱

امپیریل ہوٹل

نئی دہلی　　　　۱۷ اگست ۱۹۴۷ء

ڈیئر نیلسن!

۳ جون کے اعلان کے بعد ہندوستانیوں کا اضطراب قابل دید حیثیت رکھتا ہے۔ ایک طرف اہل ہند جشن آزادی کی تیاریوں میں مشغول اور دوسری طرف مسلمانان پاکستان کی ہجرت مجھے تعجب بھی ہوتا تھا اور بعض اوقات اہل پاکستان پر ہنسی بھی آتی تھی کہ یہ لوگ ڈھائی ماہ کی قلیل مدت میں کیونکر اس بار گراں کے متحمل ہو سکیں گے۔ تم ہی سوچو اتنی قلیل مدت میں عمارت کا تیار کرنا اور پھر ہزاروں ملازمین کا تبادلہ۔ کس قدر دشوار کام ہے۔ ایک طرف تو تمام سازو سامان تیار مل رہا ہے اور دوسرا اتنی مدت میں ایک نئی حکومت کی تشکیل کرنے پر آمادہ ہے۔ میرے خیال میں جوئے شیر لانے سے کم نہ تھی۔ لہذا قابل صد ہزار تعریف ہیں وہ لوگ جنھوں نے ایک ناممکن چیز کو ممکن بنا دیا

آخر وہ وقت بھی آگیا جبکہ آزاد ہندوستان میں دو آزاد ریاستوں نے جنم لیا۔ اور ہندوستانیوں کو اختیارات سونپ دیئے گئے۔ ۱۴ اگست کی شب کو ۱۲ بج کر ایک منٹ پر ہندوستان میں رسم انتقال اختیارات منائی گئی جولیا کے ہمراہ میں بھی وہاں گیا۔ یہ رسم ہندوستان کے دستور ساز اسمبلی میں منائی گئی۔ اس میں ہندوستان کی تقریباً

تمام قوموں کے بڑے بڑے لیڈروں کا اجتماع تھا۔ ان میں سے کچھ لیڈروں نے تقاریر بھی کیں۔ نیلسن! وہ سماں قابلِ دید تھا۔ ہر قوم ہر فرقے کے رہنما کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور چہرہ فرطِ خوشی سے دمک رہا تھا۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ ۱۵ اگست کی صبح کو میں جولیا کے ہمراہ علی الصباح نکل گیا۔ ایک عجیب منظر تھا، تمام سرکاری عمارتوں اور عوام کے مکانوں پر ہندوستان کا قومی ترنگا پرچم لہرا رہا تھا۔ ایک عجب شان کے ـــــ ساتھ۔ ایک عجب تفاخرانہ انداز میں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کپڑے کا پھریرا بھی آج اپنی قسمت پہ نازاں ہے۔ تمام شہری گلیاں اور سڑکیں اپنے شباب پر تھیں۔ ایک جلوس جا رہا تھا اور ایک آ رہا تھا۔ تمام فضا "جے ہند" "جواہر لال زندہ باد" "گاندھی جی کی جے" کے جے کاروں سے گونج رہی تھی۔ ہر شخص بہترین کپڑے زیب تن کئے مسکراتا، اٹھلاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج ہندوستانیوں کا کوئی بہت بڑا تہوار ہے، اور ٹھیک تو ہے نیلسن! جشنِ آزادی تو بڑے بڑے تہواروں سے بھی بڑا ہے ـــــ ایک ایسا تہوار ایک ایسی خوشی جو نوے سال کے شدید انتظار اور لاکھوں قربانیوں کے بعد نصیب ہوئی ہو۔ تو اس کی خوشی ہے۔ اگر ہر ہندوستانی ناچنے بھی لگتا تو کوئی جرم کوئی عیب نہ تھا۔ ان کی خوشی۔ ان کی مسرت۔ ان کا سرور۔ ان کا انبساط، ان کا تفاخر۔ ان کا ناز بے جا نہیں تھا۔ شب کو آزادی کی خوشی میں چراغاں کیا گیا۔ شہر کی کوئی جگہ کوئی عمارت ایسی نہ تھی جہاں آزادی کے جگنو نہ ٹمٹما رہے ہوں۔ تمام فضا جگمگاتے ہوئے ستاروں سے بھرپور کہکشاں معلوم ہو رہی تھی۔ ہر طرف مسرت اور شادمانی کے شادیانے بج رہے تھے ہر جگہ مختلف قسم کے جشن منائے جا رہے تھے۔ کہیں دعوتیں ہو رہی تھیں اور کہیں رقص و سرود کی محفلیں گرم تھیں۔ نیلسن! میں کن الفاظ میں ہندوستانیوں کے جوش خروش کا اظہار کروں۔ میرا دل اس سے زائد لکھنے کو چاہتا ہے۔ لیکن میں قاصر ہوں کہ الفاظ میرا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ میں نے آج تک اس سے زیادہ اجتماعی خوشی نہیں دیکھی۔ نیلسن جس طرح ہم نے دوسری جنگ عظیم کی فتح پر خوشیاں منائی تھیں۔ اس سے کہیں زیادہ ہندوستانیوں نے آزادی کا استقبال کیا

۔۔۔۔۔۔۔ نیلسن! جولیا کا خیال ہے کہ ہم کچھ دن کے لئے کشمیر جائیں بقول ایک ہندوستانی "کشمیر وادیٔ جنت ہے" ہم لوگ دو تین دن میں روانہ ہو جائیں گے۔ تم نے لکھا تھا کہ انجیلا پیرس گئی ہے اگر واپس آ گئی ہو تو مجھ بدنصیب کا سلام اس تک پہونچا دینا۔ خدا حافظ

سی، کے، متھیو

ـــــ ۵ ـــــ

ڈسٹرکٹ ہسپتال (لاہور) ۲۸ اگست ۱۹۴۷ء

ڈیر نیلسن!

میں یہ خط تمہیں لاہور ہسپتال سے لکھ رہا ہوں۔ ارے تمہارے چہرے پر تو پریشانی جھلکنے لگی، پریشان نہو نیلسن! میں تو ایسا بدبخت ہوں کہ مجھ سے موت بھی نفرت کرتی ہے۔ موت بھی مجھے اپنی آغوش میں لیتے ہوئے گھبراتی ہے میں تو اچھا خاصا ہوں۔ لیکن بیچاری جولیا۔ اپنے شوہر کی پیار بھری نظروں سے محروم! اپنے معصوم بچوں سے سیکڑوں میل دور! موت و زیست کی درمیانی منازل طے کر رہی ہے خدا سے شفا دے۔۔۔۔۔۔۔ تمہارا اضطراب بڑھ رہا ہے، اور تم اس کی وجہ دریافت کرنا چاہتے ہو۔

اچھا سنو اب۔

میں نے گذشتہ خط میں لکھا تھا کہ ہم لوگ عنقریب کشمیر جا رہے ہیں میرا تو یہی خیال تھا کہ بدید

ہوائی جہاز جائیں لیکن جولیا نے تہا کر رہ دیں مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے چلیں گے۔ لہذا میں اور جولیا بذریعہ میل دھلی سے روانہ ہو گئے۔ کیونکہ اُس کے بچے تو دہرہ دون میں تعلیم پا رہے ہیں اور اس کے شوہر کو اتنی فرصت کہاں۔ وہ بہت زیادہ مصروف آدمی ہے۔ شام کے دھندلکے میں ہماری گاڑی پنجاب کے ایک اسٹیشن پر رکی بمشکل ۵ پندرہ منٹ گذرے ہوں گے کہ قریب کے جنگل سے ایک شور سا بلند ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک بہت بڑا مجمع نعرے لگا رہا ہے اور پھر وہ نعروں کا شور ہمارے قریب تر ہوتا گیا۔ جولیا کچھ یہاں کے واقعات کے متعلق جانتی تھی اور پھر اس کے علاوہ ہمارے وہ ہم سفر (ایک شوہر اور ایک شاید بیوی، جو کہ ہندوستان کے ایک طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی پریشانی اور گھبراہٹ ظاہر کر رہی تھی کہ کوئی شدید خطرہ آنے والا ہے۔ لہذا جولیا نے کمپارٹمنٹ کو ہر طرف سے بند کر دیا دس پندرہ ہی منٹ گذرے ہوں گے کہ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ہمارے کمپارٹمنٹ پر سنگ باری ہو رہی ہے اور اسے کھولنے کی کوشش کی جا رہی ہے نعروں اور آہ و زاری کا شور اس قدر تھا کہ سمجھ میں خاک نہ آتا تھا۔ میں نے چاہا بھی کہ کمپارٹمنٹ کھول کر دیکھوں۔ کیا مصیبت ہے۔! لیکن وہ ہندوستانی میری منت سماجت کرنے لگے۔ کہنے لگے "ہماری زندگیاں خطرے میں ہیں" میں اور زیادہ پریشان ہوا۔ اور مجھ پر ایک قسم کا خوف طاری ہو گیا۔ لہذا میں پھر اپنی جگہ خاموش بیٹھ گیا۔ لیکن چند ہی منٹ گذرے ہوں گے کہ مجمع نے ہمارے کمپارٹمنٹ کی کھڑکیاں توڑ ڈالیں اور ان میں سے چند ہندوستانی کھلے ہوئے چاقو اور تلواریں لئے ہمارے کمپارٹمنٹ میں داخل ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا "آپ کا تعلق فوج سے ہے؟" میں نے جواب نفی میں دیا اور پھر فوراً یہ بھی بتایا کہ میں ہندوستان صرف سیر و سیاحت کی غرض سے آیا ہوں۔ اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر ہم سے ہم سفر ہندوستانی سے یہاں کی زبان میں کچھ کہنے لگا۔ وہ غریب جواب بھی ڈھنگ سے نہ دینے پایا تھا کہ ان میں سے ایک نے تلوار سے وار کیا اور دوسرے نے اپنا چاقو اس کی بیوی کے سینے میں پیوست کر دیا۔ میں نے ان ہندوستانیوں کو ان کی اس حرکت پر برا بھلا کہا لیکن ایک شخص نے مجھ سے فوراً انگریزی میں کہا "یہ ہمارا ہندوستانیوں کا آپس کا معاملہ ہے آپ درمیان میں دخل نہ دیں ورنہ نتیجہ برا ہو گا۔ اور پھر ان ہندوستانیوں نے ان شوہر اور بیوی کے سسکتے ہوئے جسموں کو باہر کھڑے ہوئے مجمع پر پھینک دیا اور وہ باہر کھڑے ہوئے ہندوستانی ان پر اس طرح لپکے جیسے گدوں کا گروہ ایک مردہ جسم پر جھپٹتا ہے اور دوسرے لمحے پلیٹ فارم پر خون ہی خون تھا . . . .

اُف نیلسن! اس کے تصور ہی سے میری روح لرز اٹھتی ہے میرا جسم مرتعش ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنی قوم کی خاطر جرمن اور جاپان جیسی خطرناک قوموں سے جنگ کی ہے لیکن شاید وہ بربریت میری نگاہوں نے اب تک نہیں دیکھی تھی جس کا مظاہرہ ہندوستانیوں نے آپس میں کیا . . . .

چھوٹے چھوٹے شیر خوار معصوم بچے، ضعیف و لاغر بوڑھوں کے خون سے ان درندوں نے ہولی کھیلی۔ نوجوان عورتوں کی عصمت دری کی۔ ان کے بال نوچے۔ ان کے جسموں کو سنگینوں اور چاقوؤں سے زدوکوب کیا۔

نیلسن! مجھ سے انسانیت پر یہ ظلم یہ سفاکی نہ دیکھی گئی اور میں نے اپنا ریوالور نکال کر فائرنگ شروع کر دی۔ میری فائرنگ کے جواب میں درندوں نے بھی فائرنگ کی اور ایک گولی جولیا کے داہنے بازو کو چیرتی ہوئی پار نکل گئی۔ کاش وہ گولی میرے سینے کو چھلنی کر دیتی۔ مجھے موت کی آغوش میں سلا دیتی۔

دو گھنٹے کے مسلسل قتل و غارت کے بعد جب ٹرین میں دوسرے طبقہ کا ایک فرد بھی نہ رہا تو درندوں کا گروہ مسرت و شادمانی۔ فتح و کامرانی کے نعرے لگاتا ہوا، نیم بے ہوش، نیم مردہ، روتی، چلاتی۔ سسکتی اور آہ و زاری کرتی

... نوجوان عورتوں کو گھسیٹتا ہوا۔ واپس چلا گیا۔ تقریباً آٹھ گھنٹہ لیٹ ہونے کے بعد ٹرین دوسرے دن صبح لاہور پہونچی۔ انسانیت کے خون سے رنگی ہوئی۔ زندگی سے محروم۔ زخمی اور مردہ جسموں سے بھرپور............

زخمیوں کو ہسپتال پہونچایا گیا۔ جولیا کو بھی ہسپتال کے ایک پرائیویٹ وارڈ میں رکھا گیا ہے۔ اس کا زخم بہت کاری ہے اُس کے شوہر کو میں نے اطلاع کر دی ہے۔ کل ہم لوگ بذریعہ ہوائی جہاز دہلی روانہ ہو جائیں گے۔ دعا کرو خدا اُسے شفاء عطا فرمائے۔ انجیلا کو ایک بدبخت کا سلام شوق۔

تمہارا۔ سی، کے، میتھیو

— ٦ —

امپیریل ہوٹل
نئی دہلی
۵ ستمبر ۱۹۴۷ء

ڈیر نیلسن!

لاہور سے واپسی پر تمہارا خط ملا۔ شکریہ!!

یہ پڑھ کر مسرت ہوئی کہ انجیلا نے ایک فرانسیسی ڈاکٹر سے شادی کر لی ہے۔ ارے تمہیں میرے اس جملہ پر تعجب ہو رہا ہے؟ میری تو یہ ہمیشہ سے ہی خواہش رہی ہے کہ انجیلا ہمیشہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے اُس سے عشق تھا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ لیکن میں نے یہ کبھی خیال نہیں کیا کہ اُسے میری وجہ سے مصائب کا سامنا کرنا پڑے اور جیسا کہ تم جانتے ہو میں نے سرزمین برطانیہ کو محض اسی وجہ سے خدا حافظ کہا ہے۔ اگر ممکن ہو تو ایک بدنصیب کا ہدیۂ تبریک پہونچا دینا۔ چاہتا تھا کہ یہاں سے کوئی تحفہ بھی اس کی خدمت میں روانہ کروں۔ لیکن نیلسن! یہاں سڑکیں مردہ جسموں سے، ہسپتال زخمیوں سے، میدان پناہ گزینوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ کل جن عمارات پر قومی جھنڈے لہرائے گئے تھے۔ وہاں آج موت کا پرچم لہرا رہا ہے۔ کل جہاں چراغاں کیا گیا تھا آج انسانیت کا لہو بہہ رہا ہے۔ کل جہاں مسرت و شادمانی کے باجے بجائے گئے تھے، وہاں آج زخمیوں کی آہ و فغاں گونج رہی ہے......... جولیا کی حالت انتہائی نازک ہے۔ دعا کرو خدا اُسے شفاء عطا فرمائے۔

سی، کے، میتھیو

— ٧ —

امپیریل ہوٹل
نئی دہلی
یکم اکتوبر ۱۹۴۷ء

ڈیر نیلسن!

یہ برعظیم، ہندوستان اور پاکستان، انسانوں کی بستی نہیں، یہاں انسان نہیں۔ درندے خونخوار درندے رہتے ہیں! چھوٹے چھوٹے معصوم اور بے گناہ بچوں کا خون پیتے ہیں۔ نحیف و ناتواں بوڑھوں کا گوشت چباتے ہیں۔ عصمت مآب دوشیزاؤں کی عصمت دری کرتے ہیں۔ مسلمان ہندو اور سکھوں کا دشمن ہے۔ ہندو اور سکھ مسلمان کے خون کے پیاسے ہیں۔ وہی مسلمان جنھوں نے عرب جیسے خونخوار اور درندہ صفت ملک میں خونخواری، عصمت دری اور جہالت کی جڑیں کاٹیں۔ انسانیت اور تہذیب کا پرچار کیا۔ اور خلاق عالم کا بول بالا کیا۔ اپنی قدیم تاریخ اور روایات کو ہندوؤں اور سکھوں کے خون میں نیست و نابود کر رہے ہیں۔ اور وہی ہندو جس نے

سرزمین ہند پر مسلمانوں کا استقبال کیا۔ انھیں بسا کر جہاں نوازی کا ثبوت دیا اور ہمدردیوں آہنسا کا پرچار کیا۔ آج سلمان کے خون سے ہولی کھیل رہا ہے۔.........

نیلسن! مجھے اب یہاں ایک لمحہ بھی شاق گزر رہا ہے۔ یہاں کے خونی نغمے۔ میرے جسم میں میری روح میں نشترزنی کر رہے ہیں۔ میری روح کو چھلنی کئے دے رہے ہیں جو تنیا بھی آج اس درندوں کی بستی میں سورج نکلنے سے قبل ہی۔ جھلملاتے ہوئے ستاروں کے ساتھ دور بہت دور انسانوں کی بستی سے بھی دور۔ انگلینڈ اور گرین لینڈ سے بھی دور۔ اس دنیا میں چلی گئی جہاں وہ اب ایک کلی بن کر مسکرائے گی۔

نیلسن! میں بھی آج اس درندوں کی بستی سے بہت دور چلا جاؤں گا۔ جہاں درندے نہ ہوں گے، جہاں انسان نہیں ہوں گے۔ جہاں سے انجیلا کی یاد بھی مجھے واپس نہ لا سکے گی.... .....

ممکن ہو سکے تو ایک بدنصیب کا آخری سلام۔ انجیلا تک پہونچا دینا۔

خدا اسے تا زیست خوش و خرم رکھے—

اچھا نیلسن!۔ خدا حافظ —

بدنصیب سیاح
سی ۔ کے ۔ ایتھیو

"فسانہ"

اردو میں خالص افسانوی ادب کا واحد ماہنامہ

ادارہ:۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی — محمود احمد ہنر

"فسانہ" کے متعلق اردو کے چند افسانہ نگاروں کی رائیں:۔

خواجہ احمد عباس "اردو کے اس مصیبت زدہ دور میں آپ زبان اور فن دونوں کی خدمت کر رہے ہیں"

احمد ندیم قاسمی — "فسانہ" اردو ادب کی ایک بڑی کمی کو پورا کر رہا ہے"

سہیل عظیم آبادی — "ہندوستان میں فسانہ اس وقت اردو کا بہترین رسالہ ہے اور اپنی انفرادیت کے لحاظ سے بے مثل ہے"

قرۃ العین حیدر — "آپ ایک اچھا رسالہ نکال رہے ہیں خدا کرے کہ آپ اس معیار کو قائم رکھ سکیں"

ہر ماہ "میں اور میرے افسانے" کے عنوان سے کسی ایک مشہور افسانہ نگار کا مقالہ، اس کا پسندیدہ افسانہ اور تصویر فسانہ کی مستقل خصوصیت ہے۔

سالانہ چندہ ۵ر　　دفتر "فسانہ" کڑہ - الہ آباد　　فی پرچہ ۸ر

میں انسان ہوں

گربچن سنگھ

یوں تو میں بھی حکیم سقراط کے اس قول کا قائل ہوں کہ "سنو زیادہ اور بولو کم"۔ لیکن جب میں کچھ اپنے ملنے گئے دوستوں کے درمیان بیٹھ جاتا ہوں تو یہ کم بولنے اور زیادہ سننے والا اصول فراموش کر دیتا ہوں، اور اکثر یہ بات میری بکواس کے بھینٹ چڑھ جایا کرتی ہے۔ میں ذہنی وقت میں کچھ کہہ دیتا ہوں سننے والے پریشان ہوتے رہتے ہیں۔ بہت دیر بعد مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔ وہ بھی اس وقت جبکہ کوئی میری باتوں پر توجہ نہیں دیتا۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ یہ سردی کے دن ہیں۔ آج کل چلّے کا جاڑا پڑ رہا ہے۔ لیکن رات کے وقت باہر بدن کو چھیدنے والی کیسی ٹھنڈی ہوا بہتی ہے اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ دراصل میں رات کے وقت بہت کم باہر نکلتا ہوں۔ اگر میرے کچھ دوست مجھ سے ملاقات کی غرض سے آئیں اور جھوٹ یہ کہیں کہ آج باہر کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے، تو میں فوراً ہی اُن کی باتوں کی تائید کرتا ہوا انھیں یہ جتانے کی کوشش کروں گا کہ اس سردی سے کیا کیا نقصانات ہیں۔ کھانسی، نزلہ اور زکام، اس کے علاوہ نمونیہ کا بھی ڈر رہتا ہے۔ ہاں لوگ، اور خاص کر امیر لوگ سردی کے موسم کا انتظار نہایت بے چینی سے کیا کرتے ہیں۔ سردی کے دنوں میں مقوی غذاؤں کے استعمال سے جسم میں قوت آتی ہے۔ بدن میں نیا خون دوڑنے لگتا ہے۔ وہ بھی کوئی زمانہ تھا جبکہ ہم کسی مڈل سکول میں پڑھا کرتے تھے۔ جب کبھی ماسٹر صاحب کسی موسم پر مضمون لکھنے کو کہتے، یعنی جو موسم کہ ہمیں خود پسند ہے، اس کے نقائص اور خوبیاں دونوں بیان کی جائیں۔ تو ایسی حالت میں، میں اکثر گرمی کے موسم پر اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتا تھا۔ گرمی کے موسم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان دنوں پکے پکے آم کھانے کو ملتے ہیں۔ آم سارے پھلوں کا راجہ ہے اور ہندوستان میں افراط سے ملنے والا سستا پھل ہے۔ اس کے بعد اگر دنیا والوں پر نگاہ جاتی تو اُن کے متعلق لکھتا، گرمی کے موسم میں بیچارے گداگر بھک منگے، خانہ بدوش، کھلے میدانوں اور پیڑوں تلے رہ کر اپنا گزارہ چلا لیتے ہیں۔ لیکن آج جبکہ میں کافی سمجھدار سمجھا جانے لگا ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ سارے خیالات پھولوں کی پنکھڑیوں کی طرح نازک ہیں۔ گرمی کی تپتی ہوئی لو میں غریب مزدور چند پیسے کی روزی کے لئے گھٹتے گھٹتے اپنی جان قربان کر دیتے ہیں۔ پھر برسات میں کوئی بپتا کا مارا انسان چھپر کے نیچے کسی کونے میں بیٹھا ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دیتا ہے۔ چلے کے اس جاڑے میں کوئی ننگا بھوکا کسی درخت تلے ٹھٹھر ٹھٹھر کر اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ پھر گرمی سردی اور برسات کس کس کے لئے باعث راحت ہے۔ کیا کہوں دوست میری اسقدر طویل اکتا دینے والی گفتگو سن کر ضرور مجھے پاگل سمجھنے لگیں گے۔ میں ضبط اور تحمل کا مطلب تو سمجھتا ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں نے ابھی تک زندگی میں ان سے کام نہیں لیا۔ یہ افسوس اور دکھ تو ایک دن میرے جذبات کی حدوں کو پار کر کے آنسوؤں کی شکل میں کبھی میری آنکھوں سے بہہ نکلے گا۔

جس دن شام کے وقت میں کچھ دوستوں کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھا ریڈیو پر خبریں سن رہا تھا۔ سارے دوست خبروں کے درمیان چپ تھے۔ خبریں ختم ہوتے ہی ایک دوست نے گہرا سانس لیا۔ میرے دوست کا گہرا سانس لینا اُن کی اندرونی بے چینی کا حامل تھا اور میرے لئے یہ خاص مطلب رکھتا تھا۔ ممکن ہے آپ اسے میرا

طنز سمجھیں، لیکن حقیقت یہ نہیں ہے یوں تو رفیق شیکسپیر کا ہیملٹ پڑھ کر، اور ٹالسٹائی کی Humanism پڑھ کر بھی گہرا سانس لیا کرتے ہیں۔ پھر گوئٹے ——— کو بھی پڑھ کر ———! مذہبی دنگوں کے اس منحوس دور میں، خبروں کو سن کر دوست کا گہرا سانس لے لینا شاید کوئی ایسی تعجب خیز بات نہیں۔ "آج انسانیت نے ایک مدت تک تہذیب و تمدن کی گود میں پرورش پاکر پھر حیوانیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔" وہ کہنے لگے ———

"آج اشرف المخلوقات کہلانے والے انسان میں اس قدر صلاحیت نہیں رہی کہ وہ کمزور، دکھیول، معصوم عورتوں، یتیم بچوں اور ہزارہا بے یار و مددگار لوگوں کی چیخ پکار سن لے۔ لاکھوں لوگ آج گھروں سے بے گھر ہو گئے، سینکڑوں ہزاروں مر کھپ گئے۔ والدین نہ ہوتے، عورتیں بدھوا اور بچے یتیم ہو گئے۔ پھر بھی حیوانیت ہی کا بول بالا ہے کہ جس کی حد نہیں۔"

میں کسمسایا "ہاں کیسے ہو گی حد۔ یہ تو نئے زمانہ کا انسان ہے۔ انسانیت سے انھیں واسطہ نہیں اور نہ ہی اخلاق اور روح سے۔ انھیں تو چاہئے تیز تلوار اور تفنگ۔ مال و دولت اور عیش۔۔۔ یعنی جنت۔"

وہ بولے۔ "سو۔ گ یا جنت میں رہ کر بھی ایسے لوگ کیا کریں گے۔ اگر یہی لڑنے اور مرنے کی عادت بنی رہی ——— ! لیکن دوزخ کے متعلق میں کچھ جانتا ہوں۔ متن کے بل بوتے پر نہیں۔ کچھ سچے واقعات کی بنا پر دوزخ کی حقیقت میں بتا سکتا ہوں۔ ہم اور تم دوزخی ہیں۔ دنیا کے واقعات دوزخ کے واقعات ہیں۔"

وہ پاگل کی طرح کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ "تم پاگل ہو۔ حساس ہے ——— کیا پھر میرے سامنے جاڑے کا ذکر چھیڑ دو گے اور ساتھ ہی پناہ گزینوں کا۔" ہنستے ہوئے وہ رک گئے۔ کچھ گمبھیر ہو کر بولے۔ "ارے وہ پناہ گزین نہیں کوئی لوفر ہے۔ جو پیٹ بھرنے کی خاطر یہاں درخت تلے آ بیٹھا ہے۔ یقین کرو مجھے تو یہ کچھ ———"

"بس چپ رہو ———" میں کچھ رکھائی سے بولا "تم تو پتھر ہو۔ یہ میں جانتا ہوں۔ کسی کی خاطر تمہارے دل میں رتی برابر بھی ہمدردی نہیں۔ جانے سب کچھ دیکھ کر بھی تمہارا دل کیوں نہیں پسیجتا۔ ہمیشہ تم الٹی سیدھی چھانٹا کرتے ہو۔"

پھر وہ اسی انداز میں کھلکھلا اٹھے۔ "بس تم ہو جذبات پرست، میں سچ کہتا ہوں۔ تم میرے مذاق کو بھی سچ مان جاتے ہو۔ میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ کیا کوری ہمدردی ہی سے کسی کی تکلیف رفع کر دینا چاہتے ہو۔ مانتا ہوں وہ پناہ گزین ہے۔ اس کا گھر اجڑ گیا۔ دیس سے پردیس آ بسا۔ رشتہ دار مر گئے، کچھ بچھڑ گئے۔ آج اس درخت تلے اس کا ٹھکانا ہے، ساتھ ایک جوان بیٹھی ہے جس کی گود میں ایک دودھ پیتا بچہ ہے۔ محسوس کر رہا ہوں جاڑا بڑھ رہا ہے۔ باہر سردی بدن میں یوں چبھتی ہے جیسے بچھو کا ڈنک۔ لیکن انھیں دیکھو اس پالے میں ٹھٹھرتے ہوئے رات بتا دیتے ہیں۔ انھی کی آنکھوں کے سامنے ہمارے تمہارے اور کئی لوگوں کے چھوٹے بڑے مکان کھڑے ہیں۔ ان گھروں میں رات کے آرام کا پورا سامان ہے، سب سکھ کی نیند لیتے ہیں۔ لیکن ان کا دکھ کوئی نہیں دیکھتا۔ تمھیں کیا پڑی ہے۔ جو بیکار ہمدردی کا اظہار کرتے ہو، یوں ہی مجھے دکھلانے کے لئے۔"

مجھے یہ بات چبھ سی گئی۔ واقعی مجھے بیکار بولنے کی عادت ہے گیا، پھر پناہ گزیں اور ان کے دکھ درد سے میرا تعلق یہ فقط ہمدردی ہی تو ہے۔ بیکار تم جیسے دوست ہیملٹ پڑھ کر گہرا سانس لے لیا کرتا ہے۔ میں ایک بوڑھے مریض پناہ گزیں کی قابل رحم حالت دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھر لیتا ہوں۔ ہاں ——— ! پتہ نہیں چلتا کیوں ———؟ میں دوست سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ خیر میں مکار سہی۔ پاکھنڈی ہوں۔ بولنا کم اور سننا زیادہ چاہئے۔ اسی خیال کے ماتحت چپ رہ گیا۔ خبریں ختم ہو جانے کے بعد ریڈیو میں پیانو پر سنگیت کی دھن گونجنے لگی۔ دوست سیٹی بجاتے

ہوئے اس کی سلائی میں لیے مانے لگے۔ میز پر رکھی کافی ٹھنڈی پڑ رکھی تھی۔ یہ میں اپنی ذہنی کشمکش میں کھویا ہوا اپنا کھول گیا تھا۔ اور دوست ہیپی کی لے میں مست ——!

دوسرے دن شام کا بے کیف سماں، کل رات کو بارش ہو جانے کی وجہ سے آج ہوا میں بہت نمی تھی۔ ابھرتے ہوئے اندھیرے کے ویران ماحول نے ٹھنڈک کو اور بھی تیز کر دیا تھا۔ بڑے اونچے پیپل کے پتوں پر اندھیرا پھیل کر دود اب جیسے دھند کے دھوئیں میں جم سا گیا تھا۔ میں باہر ٹہلنے نکلا تھا۔ آج یوں بھی طبیعت کچھ پریشان تھی۔ کبھی کبھی خود مجھ اپنی پریشانی کی وجہ نظر نہیں آتی۔ ٹاؤن ہال میں آج ریفیوجی ریلیف فنڈ کے لئے خاص میٹنگ تھی۔ شہر کے خاص خاص لوگوں نے عام لوگوں سے یہ اپیل کی تھی کہ انھیں اس جلسہ میں شامل ہونا چاہئے۔ گھر سے دو میل کی دوری تک کافی لمبی سڑک پر ٹہلتا ہوا میں ٹاؤن ہال پہنچ گیا۔ وہاں کچھ گنے گنے لوگ موجود تھے۔ کچھ دوست بھی مل گئے جو اپنی کوششوں پر خود ایک جگہ فخر آپ پار کرتے ہیں۔ میں ان کے قریب ہی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسٹیج پر کھڑے ہوئے ایک صاحب نے کہا۔ آج یہاں شہر کے بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار اور معزز حضرات جمع ہیں۔ اب تک انھوں نے ریفیوجی فنڈ کے لئے کافی روپیہ عطا کیا ہے۔ ہم سب اُن کے شکر گزار ہیں۔ لیکن اب روپیہ پیسے کی مدد کا سوال ایک حد تک بہت پیچھے رہ گیا۔ سوال ہے اُن کے لئے کمبل، بہن بھائی اور گھر گھاٹ کے انتظام کا، آخر وہ کیسے حل ہو۔ انھیں نوکریاں چاہئیں اور رہنے کو جگہ چاہئیں —— اگر انھیں کوئی نوکری دی جائے تو کسی حد تک جس سے کہ وہ اپنا روزگار چلا سکیں" مقرر نے ایک مثال دی۔ رپورٹ پڑھی گئی جس میں خاص طور پر بتایا گیا تھا کہ آپ نے دو بے سہارا [illegible] کو رہنے کے لئے مکان دیا اور انھیں کام کاج پر لگایا، اُن کے بچوں کے پڑھنے کا انتظام کیا۔ رپورٹ میں اور بھی بہت سی امدادوں کا ذکر تھا۔ خیرات کرنے والوں کا نام تالیوں کی بوچھار کے ساتھ ہمارے کانوں میں گونجتا رہا۔ ایک بڑی شخصیت کا نام سن کر لوگوں میں کانا پھوسی شروع ہو گئی۔ قریب ہی کوئی کھسیا کر بولا۔۔۔

"یہی نا جنھوں نے ساٹھ برس کی اس بوڑھی عمر میں ایک خوبصورت نوجوان لڑکی ہتھیائی ہے"

ایک بولا "بھئی کہ نہ، مصیبت کے مارے والدین کو کچھ روپیوں کا لالچ دے، کر بڈھے نے کیا غضب ڈھا دیا۔ بڑا دانی بنا پھرتا ہے"

دوسرے بھائی جو رپورٹ کو بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے۔ انھیں یہ بات پسند نہ آئی کہ کوئی عقلمند شخص اپنی تنگ نظری اور پست خیالی کا ثبوت دینے کے لئے کسی پر سنی سنائی تہمت لگاتا پھرے۔ وہ کچھ جھنجھلائے ——

"دوستو! کیا کسی یتیم بچی کو بیٹی بنا کر رکھنا بھی گناہ ہے۔؟"

مجھے محسوس ہوا جیسے میں بحر تفکر میں غوطے لگاتا ہوا اب حیرانگی کی چٹان سے جا ٹکرایا ہوں۔ کچھ دوستوں کی باتیں سن کر تو ایسا ہی محسوس ہوا کہ وہ شخص اپنی تنگ نظری، اور پست خیالی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ہاں میں یہ کیا سن رہا ہوں کیا یہ بات سچ ہے کہ پیسہ، اور پیٹ کی آگ، زندگی کی ضرورتیں، ایسا غلیظ کام کروا سکتی ہیں۔ کیسے۔ لیکن یہ بات تو کوئی نئی نہیں، ہوتا ہے ایسا، ایسا ہوتا آیا ہے۔ روز ہم دیکھتے ہیں۔ سڑکوں پر، فٹ پاتھوں پر، گھروں میں، کوٹھوں پر، گلی، کوچوں اور بازاروں میں۔ کھلے عام، لک چھپ کر، ہر جگہ ہر استھان پر، لیکن نہیں —— نہیں —— نہیں! جو اب سن رہا ہوں میں، میں اسے کیسے مانوں ——!

وہ بولتے، بولتے خاموش ہو چکے تھے میں بھی ساگر میں غوطے لگاتا ہوا کنارے سے آ لگا تھا۔ جب تک ہال میں کارروائی ہوتی رہی، میں سوچتا رہا، میں کیا سن رہا ہوں۔ لوگ کیا بول رہے ہیں پرائے کا دکھ کس کے لئے

تماشا، کسی کے لئے خوشنودی اور واہ واہ کا ذریعہ۔ اور کسی کے لئے کہانی اور لطیفوں کا سامان بنا رہا ہے جلسہ اب ختم ہو چکا ہال تالیوں سے گونج رہا تھا کسی دوست نے مجھے جھنجھوڑا۔ "تم کیا گم سم بیٹھے سوچ رہے ہو!"

میں نے کہا "کچھ نہیں ــــ" سنو زیادہ اور بولو کم کا زرین اصول میرے دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ لیکن وقت پر نہ بولنا بھی تو ایک طرح کی بیوقوفی ہے۔ پھر میں خود بخود بولا "میں سوچ رہا ہوں، انسانیت کی موت کب ہوئی۔ کب اس کا جنازہ اٹھا۔ کب تنگ دلی اور تنگ نظری کی چتا میں اسے بھسم کر دیا گیا۔ اور کب اس کا باقی کریا کرم ہوگا ــــ لیکن اب یہ تالیاں کیوں زوروں سے گونج اٹھیں ــــ!"

"پاگل، ہمیشہ تمہارے سر پر وحشت ہی سوار رہتی ہے پھر تم Idealist بھی بنتے پھرتے ہو۔ ادھر آؤ ہاتھ بڑھاؤ۔ یہ ہیں مسز سنگھ" ایک خوبصورت درمیانے قد کی نوجوان عورت، ہنستا ہوا گورا چہرہ۔ جس کی آنکھوں میں ایک تیز چمک تھی۔ اُن سے ہاتھ نہیں ملایا۔ نمستے کہا۔ دوست اُن کا تعارف کرانے لگے۔ مسز سنگھ بھی حال ہی میں دلی سے تشریف لائی ہیں۔ وہاں آپ ــــ کالج کی پروفیسر تھیں۔ اب یہاں مقامی گرلس کالج کی پرنسپل کی حیثیت سے اپنا کام کریں گی۔ آپ نے ریلیف کے کام میں بہت زیادہ دلچسپی لی ہے۔ مقامی نرسنگ کلب کی ممبر ہونے کی حیثیت سے مصیبت زدہ عورتوں اور بچوں کی خدمت میں آپ نے بہت دلچسپی لی ہے" ــــ

میں شریمتی سنگھ سے مل کر بہت خوش ہوا۔ یوں تو میں نے اُن کا نام پہلے بھی سنا تھا۔ پھر بھی ایک بات کے سلسلہ میں پتہ چلا کہ وہ ہمارے دور کی رشتہ دار ہیں۔ ان کے خاوند یعنی مسٹر سنگھ ایک سند یافتہ امریکہ ریٹرن بہترین انجینئر ہیں۔ ادھر شہر میں ریلیف کمیٹی کے خواتین کے ایک گروپ نے جو کپڑے، کمبل اکٹھا کرنے و سوئٹر وغیرہ بننے کی مہم چلائی تھی۔ ان کی مہربانی سے اس خدمت کا کچھ موقع ہمارے گھر والوں کو بھی ملا تھا۔ اس طرح میں ہی نہیں بلکہ گھر کے سب لوگ انھیں جانتے ہیں۔ لیکن ملاقات کا موقع ان سے پہلا ہی تھا۔ میں بہت دیر تک اُن سے تبادلہ خیالات کرتا رہا۔ پھر موجودہ سیاست پر گفتگو ہوتی رہی جس میں امپیریلزم، کمیونزم اور فسطائیت و رجعت پسندی بھی شامل تھی۔ جس کا وجود دنیا کے ہر کونے میں پایا جاتا ہے۔ واقعی ۱۹۴۷ء کے دنگوں نے دیش کے سامنے ایسی مشکلیں لا کھڑی کی ہیں جن کا جلد ہی رفع ہو جانا بہت مشکل ہے۔ انھوں نے باتوں ہی باتوں میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ "عورت تو ہمیشہ مجبور کہلاتی رہی ہے۔ لیکن اس حیوانیت کے دور میں جیسا برا سلوک اُس سے کیا گیا ہے۔ اس کے تصور ہی سے کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ جیسے عورت کچھ بھی نہیں۔ فقط ایک کھلونا ہے۔"

میں نے کہا "جس نفرت اور فرقہ پرستی نے بوڑھوں، بچوں اور نوجوانوں کے خون کی ندی بہا دی وہ عورت کی عصمت لوٹ کر اپنی ہوس پوری نہ کرتا۔ بھلا وہ کیسے ؟ ــــ"

مسز سنگھ کہنے لگیں "خیر جو ہوا سو ہوا۔ ان باتوں کو بھول کر ہم ان بہنوں کی بہبودی کا کوئی ذریعہ سوچ سکیں تو زیادہ اچھا ہے۔"

"بہبودی"! یکایک میں نے یہ الفاظ دہرائے "کیسے ان کا بھلا ہو گا ــــ!" انھوں نے میرے سامنے ایک لمبا سا لیکچر جھاڑ دیا۔ سن کر تو یوں محسوس ہوا کہ جہاں شریمتی سنگھ جیسی حوصلے والی خاتون موجود ہوں وہاں سماج میں کرپشن کے پھیلنے اور عورت ہی کو بدنام کرنے کا ذریعہ بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ لیکن یہ میری ایک بہت بڑی ذہنی کمزوری ہے۔ جب میں ان سے مل کر گھر کی طرف چلا تو ایک ہی بات میرے کانوں میں گونج رہی تھی کہ جب نوجوان رنڈوے یا غیر شادی شدہ انسان کو شادی کی ضرورت ہو تو اُن کا دھیان ان یتیم نوجوان لڑکیوں اور بدھوا عورتوں ہی کی

کی طرف جانا چاہئے۔ واقعی یہ بہت اچھی بات ہے، میں سوچتا ہوا گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ ہمارے سماج میں نہ جانے کتنے ایسے جوشیلے اور ترقی پسند نوجوان ملیں گے، جن کے خیالات اس قدر آزاد، طاقتور اور مستقل ہوں جو کہ دنیا کی بکواس کی پروا نہ کریں۔ کیا میں خود ایسا کرنے کی ہمت کر سکتا ہوں ــــــ! میں تو خود ابھی کنوارہ ہی ہوں۔ ماتا جی کو ہمیشہ میری شادی ہی کی فکر رہتی ہے۔ ہندوستانی ماؤں کو اپنے بچوں کے کھانے کپڑے اور صحت کی فکر اتنی نہیں رہتی جس قدر اُن کے شادی بیاہ کی۔ اگر میں ماتا جی کے سامنے اپنی اس طرح کی تجویز کہہ دوں تو کیا بُرا ہے۔ شاید وہ میری تجویز کی داد دیں۔ ابھی، اپنے منھ سے اتنی بات کہنے کا شاید حوصلہ نہ ہو۔ ہاں دوستوں کے منھ سے یہ بات نہایت آسانی سے کہلائی جا سکتی ہے۔ چلتے چلتے یکایک میں کسی شے کی ٹھوکر کھا کر سنبھلا۔ کچھ نیچے جھک کر غور سے دیکھا۔ کوئی لیٹا گہری نیند لے رہا تھا۔ لیکن اتنی ٹھنڈ میں، کھلی سڑک پر کھلی ہواؤں میں، کون ہے یہ ــــــ!

اس سوال کے ساتھ اور بھی سیکڑوں باتیں میرے دل میں اُٹھنے لگیں۔ دو قدم آگے چل کر میں پھر پلٹا۔ میں نے سونے والے کو ذرا جھنجھوڑا ــــــ پھر ذرا زور سے جھنجھوڑا۔

"ارے ــــــ او جی سونے والے ــــــ!" سونے والے کی نیند نہیں ٹوٹی۔ شاید بہت گہری نیند لے رہا تھا۔ وہ ہلا تک نہیں۔ میں نے اور جھک کر اُسے دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑا۔ "ارے بھائی سنتے ہو ــــــ" لیکن نہیں میری آواز اُسے میٹھی نیند سے بیدار نہ کر سکی ــــــ اس پر کچھ غصہ سا آنے لگا۔ ممکن ہے کوئی شرابی ہو۔ کمبخت پی کر بے سُدھ پڑا ہے۔ "تم کیوں کھڑے اپنا سر کھپا رہے ہو۔ اپنی راہ لگو۔" دل میں کسی نے کہا ــــــ لیکن مجھے تو اپنا فرض پورا کرنا ہے۔ "فرض" یوں محسوس ہوا جیسے میں خود اپنا مذاق اُڑا رہا ہوں۔ ایک مرتبہ پھر خواہش ہوئی کہ اُسے زور سے جھنجھوڑ دوں۔ اس مرتبہ محسوس ہوا، سونے والا ابدی نیند سو رہا ہے۔ اُسے نہ تو اس پالے کا ڈر ہے اور نہ ہی چبھنے والی ٹھنڈی ہوا کا، نہ اُسے راہ چلتے گنڈے اور چوروں کا خطرہ ہے اور نہ ہی بھونکتے کتوں کا ــــــ وہ بے خوف پڑا ہے۔ نہ اُسے اپنی سدھ ہے نہ دنیا کی۔ سارے دکھوں کو تکلیفوں کو بھول کر آج وہ شخص اطمینان کی نیند لے رہا ہے۔ شاید یہ شرابی نہیں۔ لیکن اب تو اس نے ایسی پی لی ہے کہ جس کا نشہ کبھی اُترے گا ہی نہیں۔ انسان کو اس سے بڑھ کر اور کونسا سکھ چاہئے۔ لیکن موت ــــــ اس کے تصور ہی سے تن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تصور شعور کے لئے ایک امر ی حقیقت ہے، اور موت تو حقیقت ہے ہی۔ ایک اٹل حقیقت ــــــ! یہاں کھڑے ہو کر سوچنے سے فائدہ؟ کیا یہاں میرا کھڑا ہونا ٹھیک بھی ہے۔ نہیں! ــــــ نہیں ــــــ!! پھر میں آگے بڑھا۔ میرے حساس دل میں خوف سماتا چلا گیا ــــــ ہاں اب یہاں کھڑا ہونا ٹھیک نہیں۔ اگر میرے یہاں کھڑے رہنے سے کوئی فائدہ ہو تو کھڑا بھی رہوں۔ لیکن فائدہ ــــــ؟ کیا فائدہ ہوگا میرے اس مردے کے پاس کھڑے رہنے سے۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے ایک شاعر نے کہا ہے۔ یہ دنیا ایک اسٹیج ہے، جہاں لوگ آتے ہیں۔ اور ایک اداکار کی طرح جیون ناٹک ختم کر کے چلے جاتے ہیں۔ ایک اور فلسفی شاعر کہتا ہے موت زندگی ہے انسان کا جسم ایک گھڑا ہے۔ جس میں رحیم یارام اپنی رحمت سے زندگی کا آبِ حیات اُنڈیلتا ہے اور جب جی چاہتا ہے اُسے خالی کر دیتا ہے ــــــ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ دھند اب اس قدر گہری ہو گئی تھی کہ سڑک کی روشنی بھی صاف نظر نہیں آتی تھی۔ کچھ دور محلوں سے کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جسے سن کر یوں محسوس ہوتا تھا ایک نہیں ہزاروں زندگیوں نے موت کا کالا کفن اوڑھ رکھا ہے۔ لیکن دو ٹکڑوں پر دم ہلانے والے رات کے ہوشیار پہرے دار دل میں فرض و فکر کا

احساس لئے چیخ رہے ہیں۔ وہ ایک انسان فکر و تدبر سے کنارہ کش ایک ابدی اور میٹھی نیند سو رہا ہے۔ میں کچھ تیز قدم بڑھاتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ سوچتا ہوا، کتنے ہی دن بیت گئے ہیں، ایک دنیا کی بہت بڑی جنگ کو ختم ہوئے۔ لیکن پھر بھی ایک آواز کانوں میں گونج سنائی دے رہی ہے۔ شانتی، شانتی! پوپ کہتا ہے شانتی ـــ دھرماتما دنقیر کہتے ہیں امن، امن ـــ! لیڈر کہتے ہیں شانتی۔ لیکن مجھے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ میرے قدموں کی چاپ سڑک کی کالی چھاتی پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی ہے۔ اس طرح ایک خاموشی کا سکوت ٹوٹ رہا ہے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سرسراتے ہوئے درختوں کے پتے فضا کی خاموشی کو توڑ کر اس کا سکون چھین رہے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا مرنے والا سڑک کے کنارے پڑا ہوا مہذب بناوٹی تہذیب و تمدن کے گھناؤنے زخم کو کرید کر اس کا سکون چھین رہا ہے۔ پھر شانتی کہاں۔ شانتی نہیں تو سکھ کہاں ہے۔ ہوائی جہازوں پر اڑنے والے کے ذہن میں دھرتی سے دور۔ بابُنہ کوٹھریوں میں بیٹھکر قانون بنانے والوں کے دماغ میں ـــ

گھر کے قریب پہنچ کر دیکھا۔ پیپل کے درخت تلے وہی پناہ گزیں جنھوں نے کچھ کپڑوں کو تان کر اپنا رین بسیرا بنا رکھا ہے۔ اندر بکھرے پڑے ہیں۔ ماں باپ، اور بہن بھائی، بوڑھے۔ بچے اور جوان ایک دوسرے سے لپٹے لپٹائے اور سہمے ہوئے۔ یہ بھی تو سکھ اور شانتی چاہتے ہیں۔ ان کا بھی کوئی قصور ہے جو گھر بار لٹا کر یہاں آپڑے؟

اپنے کمرے میں بیٹھا میں سوچ رہا تھا کہ مسز سنگھ کی بات ٹھیک ہے۔ پڑھے لکھے نوجوان کو ملکر ایک ایسا تعمیری کام کرنا چاہئے جس سے سماج میں گراوٹ پیدا نہ ہو۔ کوئی اور کمزوری نہ آجائے۔ اس کام کے لئے سب سے پہلے مجھے ہی تیار ہونا چاہئے۔ میں نے ماتا جی سے اس بات کا ذکر کیا۔ انھوں نے جھڑک کر کہا: "بکواس یہ سب فالتو باتیں ہیں ـــ"

میں نے کہا "آج ہی کی رات دیکھئے نا، ماتا جی کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہے۔ رات بھی کتنی اندھیری ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں پیپل کے پیڑ تلے لیٹے ہوئے پناہ گزینوں کو برآمدے کے کسی کونے میں رات بسر کرنے کی اجازت دیدوں آخر ان کے بھی بچے ہیں۔ ایک جوان لڑکی ہے۔ کیسے رات کٹتی ہوگی ان کی!"

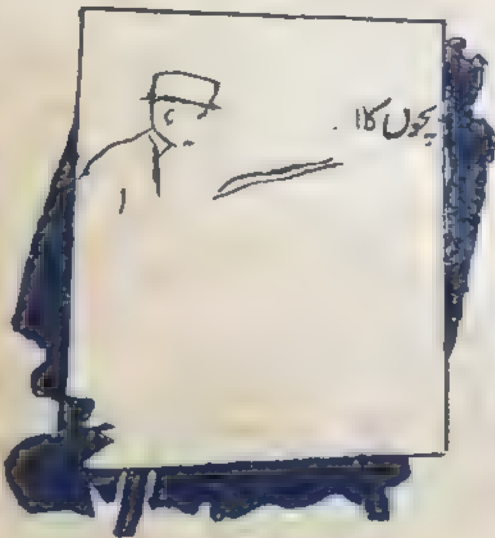
کہنے لگیں "سنا ہے یہ چور ہوتے ہیں، بدچلن ہوتے ہیں۔ میں تو ایسوں کو گھر کے قریب کبھی نہ پھٹکنے دوں۔ محلے والوں نے کل ہی ایک رائے ہو کر انھیں یہ جگہ چھوڑ دینے کا حکم دیا ہے"

سن کر یوں محسوس ہوا جیسے دنیا پاگل ہو چکی ہے۔ پاگلوں کی بے ہنگم آوازیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میرا جی چاہا میں زور سے چیخوں، یہ سراسر جھوٹ ہے، بے انصافی ہے، ظلم ہے، کسی کی مصیبت کو دیکھ کر اس کا مذاق کیوں اڑایا جاتا ہے۔ انسان کو پتھر نہیں انسان ہی بنا رہنا چاہئے۔ میں دیکھونگا کون انھیں یہ جگہ چھوڑنے پر مجبور کرے گا۔ ممکن تھا کہ یہ سب سوچتا ہوا اب میں اپنی بکواس شروع ہی کر دیتا کہ سامنے دیوار پر ایک بورڈ ٹنگا نظر آیا۔ اس بورڈ پر میں نے یہ عبارت لکھ رکھی ہے "بولو کم اور سنو زیادہ" میرا تو جی چاہتا تھا بولتا ہی جاؤں۔ جس قدر بول سکوں کم ہے۔ لیکن پھر یہ سنکر حیرت ہوئی کہ گھر کے لوگ کہہ رہے ہیں۔ "کیوں فالتو بکواس کر رہے ہو۔ جذبات کی رو میں بہہ جانا کوئی بڑی بات نہیں"

دوسرے دن صبح سویرے شہر کے کچھ خاص حصوں میں کرفیو لگ گیا۔ افواہ پھیل رہی تھی۔ کل رات ایک ہندو کو کسی مسلمان نے مار ڈالا۔ کمبخت نے بری طرح چاقو سے اس کے جسم پر جابجا زخم لگائے ہیں۔ کچھ حصہ تو کاٹ کر ہی الگ کر دیا ہے ـــ میں خاموش سنتا رہا۔ دنیا شانتی چاہتی ہے۔ ایک مرنے والا سڑک کے کنارے

مگر امن چاہتا ہے۔ ایک بھوکا کتا یا گیدڑ اس کی بوٹی نوچ کر اپنے بھوکے پیٹ کی شانتی چاہتا ہے۔ کرفیو والے امن چاہتے ہیں، حکومت کی گولی امن چاہتی ہے۔ حکومت امن چاہتی ہے۔ قوم امن چاہتی ہے۔ بڑی بڑی حکومتیں امن چاہتی ہیں۔ سیکیورٹی کونسل بھی شاید امن ہی چاہتی ہے۔ لیکن کون امن نہیں چاہتا......؟ ہنسی آتی ہے۔ انسان کی عقل شانتی نہیں چاہتی۔

میں نے دیکھا اسی دن ملٹری کے کچھ آدمی آئے، اور پیپل کے درخت تلے چادر تان کر رات کو ٹھٹھرنے والے بے گھروں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ کہاں لے گئے ——— جانے کیوں میں نے یہ جاننا ضروری نہ سمجھا ہاں پیپل کے درخت تلے ایک ویرانی ——— نہیں شانتی چھائی ہوئی تھی۔ اُن کے چلے جانے کے بعد محلے میں اُن کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں گھڑی جانے لگیں۔ جنہیں سن کر سر شرم سے نیچے جھک جاتا تھا کہانیاں تو میں بھی بہت بنا سکتا ہوں۔ بول سکتا ہوں۔ لیکن میرا تو اصول ہے "بولو کم اور سنو زیادہ"۔ لیکن اب دنیا میں سننے کو ہی کیا گیا ہے۔ جی چاہتا ہے یہی سوچتا رہوں۔ ایسی سردی میں کھانسی، نزلہ، زکام اور نمونیہ ہی کا خطرہ نہیں۔ بلکہ میرے پاگل ہو جانے کا بھی خطرہ ہے۔ میرے پاگل ہونے سے پہلے دنیا پاگل ہو چکی ہے ایک انسان کتے کی طرح بے آسرا ہو کر اپنی جان دے دیتا ہے۔ کچھ تہذیب یافتہ لوگ کسی مظلوم بے گھر انسان کو اس لئے اپنے گھر کے قریب رہنے دینا نہیں چاہتے کہ اس کے ساتھ ایک جوان لڑکی ہے۔ یہ بات تو کوئی نئی نہیں ہوتا ہی ہے ایسا۔ دنیا دیکھتی ہے۔ سڑکوں پر فٹ پاتھوں پر۔ گھروں میں۔ گلی کوچوں میں، کوٹھوں پر اور بازاروں میں کھلے عام اور لک چھپ کر، ہر جگہ ——— ہر مقام پر ——— لیکن ——— نہیں! ——— نہیں! ——— نہیں!!! میں اسے بھی ماننے کو تیار نہیں، کیونکہ میں انسان ہوں ——— انسان ———!



جنسی تعلیم
کٹنگس
رسالوں کا قحط

جائزے

ادب زندگی کی تخلیق کرتا ہے اور زندگی ادب کی خالق ہے!

اصغر انصاری

جنسی تعلیم

موجودہ دور میں کون ہے جو اس حقیقت سے انکار کر سکے کہ جنسی تعلیم بچوں کے لئے اشد ضروری نہیں ہمارے "بزرگ" خود ہی جنسی جہالت کا شکار ہیں اور بچوں کی جنسی بے راہ روی کی تمام تر ذمہ داری انھیں کے سر آتی ہے۔ یہ امر آپ سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ بچوں میں جنسی بدنظمی کے بیج خود ہمارے والدین کے بوئے ہوئے ہوتے ہیں، جہالت کے گہوارے میں بچوں کی پرورش ہوتی ہے۔ اور زندگی کے وہ واقعات جن سے ان کی آئندہ تمام زندگی وابستہ ہوتی ہے اُن سے پوشیدہ رکھے جاتے ہیں۔ اس غلط تربیت کا بدترین ردِعمل یہ ہوتا ہے کہ بچے اپنے بزرگوں کے جنسی اندازِ نظر کی جو پہلے ہی غلط اور گمراہ کن ہوتا ہے نقل کرنی شروع کر دیتے ہیں۔

گذشتہ برسوں میں جنسیات پر کافی مواد جمع ہو گیا ہے۔ اور اب تعلیم یافتہ والدین محسوس کرنے لگے ہیں کہ انھیں اس مجرمانہ خموشی کا طلسم توڑنا ہی پڑے گا اور کچھ نہ کچھ جنسی معلومات نوجوانوں کو پہنچانا ہی ہوگی اب اس پر عمل اس طرح ہوتا ہے کہ بچے جب سنِ بلوغ کو پہنچ جاتے ہیں تو اُن کے والدین جنھوں نے ادھر ادھر سے کچھ جنسیات پر کتابیں پڑھی ہیں اپنے آپ کو اپنی اولاد سے جنسی مباحثے کے لئے تیار کرتے ہیں اس گفتگو کے دوران میں ماحول اس قدر کشیدہ اور پریشان کن ہوتا ہے کہ یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اولاد زیادہ گھبرائی ہوئی ہے یا والدین زیادہ مضطرب ہیں۔ بہرنہج اس مہم کو کچھ اس طرح سر کیا جاتا ہے کہ گویا ایک فرض ناگوار اور بارِ گراں کسی طرح سر سے اتار پھینک دیتا ہے بس لیجئے یہ دماغی کشمکش ختم ہوئی اور صاحبزادے صاحب گویا جنسیات کے ماہر ہو گئے۔ اس حادثے کے بعد پھر وہی دیرینہ خوردی اور بزرگی کے تعلقات اولاد اور والدین کے درمیان قائم ہو جاتے ہیں۔

یہی ایک طریقہ ہے جس طریقے پر یہ کام ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ اس طرح کی بے جان ڈرامائی گفتگو کا سب سے زیادہ خطرناک اور زہریلا اثر نوجوانوں کے دلوں پر یہ قائم ہوتا ہے کہ جنس کوئی ایسی بعید الفہم عجیب اور پراسرار چیز ہے جس کو تالے اور کنجی میں بند کر کے رکھنا بہت ضروری ہے ورنہ کیوں اس مخفی اور گھبرائے ہوئے انداز میں گفتگو کی جاتی۔ برخلاف اس کے حقیقت یہ ہے کہ جنس اور اس کے متعلق جتنی چیزیں ہیں ان کا حیاتِ انسانی سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ اور درحقیقت ہم زندگی اور جنس کو علیحدہ علیحدہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ جنسیات ہی اصل زندگی ہے۔ اور وہ اس کے تانے بانے سے بنی ہے جب ہمارا جنسی اندازِ فکر ہی غلط ہو تو سمجھ لیجئے کہ ہمارا پورا نظریۂ حیات ہی غلط ہے ہماری تمدنی اور معاشرتی زندگی میں جنس اس طرح مدغم ہے کہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جنس زندگی اور زندگی جنس ہے۔ اگر ہم اس بات کو مانتے ہیں تو پھر ہم کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ احساسِ جنسی ماں کی گود سے شروع ہوتا ہے اور گوشۂ قبر میں ختم ہوتا ہے، پھر اگر یہ بات ہے تو جنسی گفتگو کے آغاز کے لئے کسی خاص عمر کا تعین یا انتظار بالکل غلط سی چیز ہے۔ کیا اس خاص عمر تک پہنچنے سے پہلے جنس کا وجود نہیں ہوتا ؟

اگر ہم فرائیڈ کے اُن نظریات کو غلط بھی تصور کر لیں جن کا تعلق شہوانی مظاہرات سے ہے تب بھی یہ بات ظاہر ہے کہ بچے میں اپنی عمر کے دوسرے سال کے اختتام تک اپنے عضوِ تناسل کا شعوری احساس پیدا ہو جاتا ہے اور

تیسرے سال میں بالعموم وہ پوچھنے لگتا ہے کہ وہ اپنی بہن یا بھائی سے مختلف کیوں ہے۔؟ بعد کے سالوں میں پھر وہ معمے حل کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے "یہ مرغی کے بچے کہاں سے آئے"؟ "میں کیسے بنا تھا"؟ "اور میں آیا کہاں سے"؟ یہ سوالات بچہ اُسی انہماک اور حیرت سے پوچھتا ہے جس طرح وہ دوسرے ہزاروں سوالات اپنے ماں باپ سے کرتا ہے ظاہر ہے ان سوالات کے جوابات بھی اتنی ہی صفائی اور سچائی سے دینا چاہئیں جس طرح اس کے "دوسرے سوالوں کے جواب" دیئے جاتے ہیں۔ تمام ماہرینِ جنسیات کی متفقہ رائے ہے کہ بچوں کی جنسی تعلیم جہاں تک کم از کم مفردات یا عناصر کا تعلق ہے، جتنی جلدی شروع ہو سکے اتنا ہی بہتر ہے اور اس کام کے لئے ایک سمجھدار ماں سے زیادہ بہتر اتالیق ملنا ناممکن ہے۔

یہاں یہ بات سمجھ لینا بہت ضروری ہے کہ بچوں کا پیدائش کے متعلق استفسار کوئی جنسیاتی علامت نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کا تعلق تجسس فطرت، انکشافِ حقیقت اور تفحص راز سے ہوتا ہے۔ اس لئے یہ سوالات اتنے ہی فطری ہوتے ہیں جتنے یہ سوال کہ سورج شام کو افق کے اس پار کہاں چلا جاتا ہے۔ اُن کے سوالات کے جوابات اتنے ہی صاف اور واضح دینا چاہئے جتنے ان سوالوں کے جواب دیئے جاتے ہیں۔ ہاں، یہ ضروری نہیں ہے کہ بچے کی راز جو فطرت کی تسکین کے لئے آپ اسے سورج کے غروب ہونے کے متعلق علم الافلاک کے نکات سمجھانے لگیں۔ تولیدِ نسل کے متعلق آپ کو اُسے سادہ مگر نہایت واضح اور سلیس زبان میں جواب دینا چاہئے۔ ایک دفعہ اگر آپ اُسے تسلی بخش جواب دے دینگے۔ تو اس کی توجہ پھر فوراً دوسرے سوالات کی طرف منعطف ہو جائے گی۔ اور اُن دوسرے سوالات کے جوابات نسبتاً آسانی سے دیئے جا سکیں گے۔ مثلاً "آگ گرم کیوں ہوتی ہے"؟ "آسمان کا رنگ نیلا کیوں ہوتا ہے"۔؟ "بارش کہاں سے ہوتی ہے"؟ "بادل کیا ہوتے ہیں"؟۔ یہ ایک سمجھدار ماں ہی کا کام ہے کہ وہ بچوں کے مضطرب اور متجسس دل و دماغ کو تسکین پہنچائے اور اس دنیا کے متعلق تسلی بخش جواب دے جو اُن کے لئے بالکل نئی ہے

اس فطری اسلوب اور طریقۂ کار پر عمل کرنے سے بچے بلوغت کی عمر تک پہنچنے سے پہلے وہ سب کچھ سیکھ لیتے ہیں جس کا سمجھ لینا اور جان لینا ان کے لئے ضروری ہوتا ہے اور وہ ان باتوں کو صرف سمجھ کر قبول ہی نہیں کر لیتے بلکہ ان معلومات اور انکشافات کی اُن کے دل میں ایک خاص اور صحیح جگہ پیدا ہو جاتی ہے۔ جب اُن کے جذبۂ تجسس کی تسکین ہو جاتی ہے تو پھر وہ اس موضوع کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں، کم از کم اس وقت تک کے لئے تو ضرور، جب تک کہ اُن کے دل کے افق پر نئی پیچیدگیاں، نئی گتھیاں، نئے معمے اور نئے سوالات ہویدا نہیں ہوتے۔

بچہ جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے، وہ ابتدائی جنسی تربیت جو اس نے ایک سمجھدار ماں اور ایک مشفق باپ سے حاصل کی ہوتی ہے، اسکول، کالج کی اعلیٰ جنسی تعلیم میں صرف پسِ منظر ہی کا کام نہیں کرتی بلکہ اس کی اعلیٰ تعلیم میں بہت ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ اکثر والدین جنسی تعلیم کی تمام تر ذمہ داری اسکول کے ماسٹروں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ انگلستان کی سوشل ہائی جین کونسل بھی ایک دفعہ کچھ تجرباتی تحقیقات کے بعد اسی نتیجے پر پہنچی تھی۔ لیکن اس کے برخلاف انگلستان کی انجمن اساتذہ کی مجلس منتظمہ نے بچوں کے نصابِ تعلیم میں علم الحیات کی اہمیت مانتے ہوئے ایک تجویز یہ منظور کی تھی کہ بچوں کو اسکولوں میں جنسی تعلیم دینا نامناسب ہے اور بچوں کے عام مفاد کے خلاف ہے۔ لیکن حالیہ صورت یہ ہے کہ اکثر والدین یہ ذمہ داری اساتذہ کے سر تھوپتے ہیں۔ اور اساتذہ والدین کے سر منڈھتے ہیں۔ مگر میرے خیال میں دونوں طریقۂ تعلیم ضروری ہیں۔ وہ اس طرح کہ والدین بچوں کا ابتدائی استعجاب مٹائیں اور اساتذہ ابتدائی علم الحیات کے اسباق کے ذریعے اُن کی پیاس بجھائیں۔ یہ دونوں

طریقۂ تعلیم ایک دوسرے کے بدل نہیں ہیں، بلکہ متمم ہیں۔

یہ تو صحیح ہے کہ علم الحیات کی تعلیم کا طریقہ کار بائیں نمائندہ بہ حیثیت دیا جائے۔ لیکن علم النباتات کے نصاب کو جنسی تعلیم کا ذریعہ بنانا صریحاً غلط ہوگا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اکثر دودھ پلانے والے جانوروں کا طریقۂ تولید سمجھانے کے لئے اساتذہ درختوں اور پودوں کی افزائش نسل کے مسئلے کو ذریعہ بناتے ہیں۔ یہ بات غلط ہے۔ بلکہ پودوں اور درختوں کے مسئلہ تولید کو اس قدر غیر شخصی انداز میں بیان کرنا چاہئے کہ بچے کو کسی قسم کا شعوری یا غیر شعوری احساس ہی نہ ہو کہ اس مسئلہ کا حیاتِ انسانی یا افزائش نسلِ انسانی سے کوئی تعلق ہے

ڈکر (TUCKER) اور پراوٹ (PROUT) نے اپنی کتاب "مدارس میں جنسی تعلیم" میں تحریر کیا ہے کہ ایک جماعت میں جہاں مندرجۂ بالا طریقہ کا استعمال کیا گیا وہاں جیسے ہی دودھ پلانے والے جانوروں کی تولیدِ نسل کا ذکر آیا ویسے ہی جماعت کے طلبا میں ایک ہیجانی کیفیت ایک خاص قسم کی بے چینی نمایاں معلوم ہوئی جس سے اساتذہ اور طلبا دونوں ہی یکساں متاثر معلوم ہوتے تھے۔

میں نے اس مضمون کے شروع میں کہیں اس بے جان اور ڈرامائی گفتگو کا جو والدین اپنی بالغ اولاد سے کرتے ہیں ذکر کیا اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بلوغت اپنے ساتھ پیچیدہ مسائل کی گتھیاں نہیں لاتی یا ان گتھیوں کے سلجھانے میں اولاد کو اپنے والدین کی مدد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہر عمر کے چند مخصوص مسائل اور چند مخصوص میلانات ہوتے ہیں۔ بلوغت ایک لڑکے یا لڑکی کی زندگی میں ایک نہایت ہی نازک دور ہوتا ہے اور بدقسمتی سے بعضوں کے لئے تو یہ دور اپنے ساتھ جنسی بدنظمی اور پیچیدہ الجھنیں بھی لاتا ہے۔ بلوغت گویا پہلا تجربہ ہے جوانی کے بے پایاں سمندر کا جس میں تیر کر انھیں گزرنا ہے۔ اس نازک دور میں نوجوانوں کو خود محسوس کرنا چاہئے کہ اگر واقعی کسی جنسی مسئلہ میں انھیں کسی کی مدد کی ضرورت ہے تو وہ صرف اُن کے والدین ہیں۔ جن سے انھیں رجوع کرنا چاہئے۔ لیکن اگر بدقسمتی سے والدین نے اُن کے سوالات کے جوابات تشفی بخش نہیں دیئے ہیں یا اُن سوالات پر پریشانی کا اظہار کیا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسے نوجوان ہرگز ان سے رجوع نہیں کریں گے۔

یہاں بلوغت کے متعلق یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ نسل اور موسم کا اثر بلوغت کے اظہار پر بہت پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ سرد ممالک میں بچے نسبتاً دیر سے بالغ ہوتے ہیں اور گرم ممالک میں جن میں ہندوستان بھی شامل ہے نسبتاً جلدی بالغ ہوتے ہیں۔ یہ بھی خیال ایک حد تک صحیح ہے کہ شہری زندگی میں بچے زیادہ جلدی بالغ ہوتے ہیں۔ اور وہ بچے بھی جو عیش و عشرت کی زندگی میں پروان چڑھتے ہوں بہ نسبت اُن بچوں کے جو غربت کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں جلدی بالغ ہو جاتے ہیں۔

بلوغت کی عمر پہنچنے کے بعد جن مسائل سے بچے دوچار ہوتے ہیں ان میں سب سے اول احتلام شب ہے جس کو بالعموم "خواب" کہتے ہیں۔ یہ ایک بالکل جسمانی چیز ہے بلکہ دراصل ذریعہ ہے جنسی غدودوں کی رطوبت کے اخراج کا، اسی لئے احتلام کے بعد کچھ جسمانی سکون سا مل جاتا ہے۔ رگوں کا کھچنا، بدن کا تناؤ ختم ہو جاتا ہے۔ اور ایک طرح کی جنسی ہم آہنگی کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ اس تناؤ اور اس الجھن سے چھٹکارہ پانے کے لئے بچے جلق شروع کر دیتے ہیں اور اگر نہ کریں تو قدرت خود اس کا انتظام احتلام کی صورت میں کر دیتی ہے۔ احتلام کے لئے یہ ضروری نہیں کہ کوئی ملذذ خواب دکھائی دے۔ چوں کہ لوگوں کے جسم کی ساخت اور

اٹھان مختلف ہوتی ہے اس لئے بعض بچوں کو جنسی سکون جلد ہو جاتا ہے اور بعض کو دیر میں، لیکن پھر بھی اوسطاً مہینے میں تین چار دفعہ سے زیادہ "خواب" نہیں ہونا چاہیئے۔

اب یہ سمجھ لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے کہ ایک حساس لڑکے کے لئے یہ "خوابی" مسئلہ کتنا پریشان کن ہوتا ہوگا اور بالخصوص اس صورت میں جبکہ ابتدائی جنسی تعلیم و تربیت سے محروم رکھا گیا ہو۔ اس مسئلہ کی نوعیت اور کتنی زیادہ پریشان کن ہو جاتی ہوگی جب وہ یہ دیکھتا ہوگا کہ وہ "بزرگ" جو اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ ہر قسم کے جنسی مظاہرات کو صرف معیوب ہی نہیں سمجھتے بلکہ گناہ بھی سمجھتے ہیں۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دن رات انہی خیالات میں الجھا رہتا ہے اور جتنا وہ ان خیالات سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اتنا ہی وہ گویا لاشعوری طور پر اور الجھ جاتا ہے، تا آں کہ اس کی تمام تر توجہات کا مرکز صرف جنس ہو کر رہ جاتا ہے، اس طرح ایک ایسا فاسد چکر قائم ہو جاتا ہے جس سے اس کا نکلنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس سے صرف اس کی صحت ہی پر اثر نہیں پڑتا بلکہ اس کے اندر کچھ نفسیاتی گتھیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور گویا جسم و دماغ دونوں ہی حیثیت سے وہ بیمار ہو جاتا ہے۔

اگر اس کی ابتدائی جنسی تربیت صحیح اسلوب پر ہوئی ہوتی، اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ جنس اور گندگی ایک دوسرے کے مترادف نہیں ہیں بلکہ جنس زندگی کا ایک مقدس چشمہ ہے، اس کے اندر کوئی گناہ پوشیدہ نہیں ہے، یہ کہ اب وہ جوانی کے حدود میں قدم رکھ رہا ہے اور یہ بھی کہ بیش از ضرورت رطوبت کے اخراج کا یہی ایک صحیح راستہ ہے تو تو اس طرف توجہ کرنے کے بجائے وہ اپنا وقت کھیل و تفریح، دوست احباب کی محفل اور دیگر دل پسند مشغولیتوں میں صرف کرتا۔

بچے کے سن بلوغت کو پہنچنے کے بعد والدین کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ باقاعدہ طبی معائنہ کرانے کے بعد یہ یقین کر لیں کہ بچے کے تناسلی اعضاء میں کسی قسم کی بیماری یا ان کے نشو و نما میں کوئی رکاوٹ تو نہیں ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا اور نہیں کیا جاتا ہے، تو اکثر و بیشتر وہ بچے جنہیں اس قسم کسی کا عارضہ ہوتا ہے ان کا تمام وقت ان ہی الجھنوں میں صرف ہو جاتا ہے اور چونکہ وہ اپنا "حال دل" کسی سے کہتے نہیں اور اسی کے متعلق سوچتے رہتے ہیں۔ اس لئے ان میں ایک قسم کا اعصابی ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اس کے اثرات انکی تمام زندگی پر چھا جاتے ہیں۔ والدین کا کام صرف پند و نصائح پر ہی نہیں ختم ہو جاتا۔ والدین کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ نوجوان اولاد کے دماغ میں یہ بات کبھی آتی ہی نہیں کہ اسے اپنی جنسی پریشانیوں کا ذکر اپنے والدین سے کر کے ان کی مدد مانگنی چاہیئے جس طرح دیگر مسائل میں وہ ہمیشہ ان سے رجوع کرتے رہتے ہیں۔ والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کے دلوں میں یہ راسخ کرا دیں کہ وہ ان کے بہترین مددگار اور ہمدرد دوست ہیں اور اگر وہ اپنے مسائل ان کے سامنے رکھیں گے تو وہ صرف ہمدردی سے سنیں گے ہی نہیں بلکہ ان کو حل کرنے میں پورا اشتراک کریں گے۔ والدین کو اس گفتگو میں رسمی رعب و داب کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیئے اور ایسا ماحول پیدا کرنا چاہیئے کہ بچے بغیر کسی رسمی لحاظ اور جھجک کے خود ہی کھلے اور واضح الفاظ میں اپنی تکالیف ان کے سامنے رکھ سکیں۔

حلق کے حوالے کے بغیر جنسی تعلیم کی بحث تشنہ رہ جاتی ہے۔ اس ضمن میں اس قدر نکمی، فضول، لغو اور پوچ باتیں لکھی گئی ہیں کہ ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ یہ لچر باتیں، یہ فاسد اور مہلک خیالات دراصل ہم تک دو وسیلوں سے پہنچے ہیں ایک تو ان نیم حکیموں کے ذریعہ جو نوجوانوں کے دلوں میں خوف و ہراس پیدا کر کے اپنا الو سیدھا کرتے ہیں اور دوسرے ان اخلاق کے ٹھیکیداروں کے ذریعہ جو اپنی مطلب برآری کے لئے یہی بہتر اور منفعت بخش سمجھتے ہیں کہ لوگوں کو ڈرا کر

"نیکی" کی راہ پر لگائیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس موضوع پر اس قدر مہلک لٹریچر جمع کر دیا گیا ہے کہ الاماں، الحفیظ! یہاں تک کہ نامردی سے لیکر جنون تک تمام بیماریاں اسی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔

جب ہم اس سوال کی چھان بین بے لوث طریقہ سے کرتے ہیں، یعنی تمام ذاتی جذبات اور اثرات سے ہٹ کر صرف تلاشِ حق کے لئے، تو ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں اور حیوانوں میں اس کا اس قدر رواج ہے کہ اس کا تعلق براہ راست فزیالوجی سے ہے۔ اس سلسلہ میں یورپ اور امریکہ میں کافی تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ "ڈاکٹر ڈیوکس (DR. DUKES) کا بیان ہے کہ رگبی (RUGBY) کے مشہور اسکول میں اس علت میں مبتلا ہونے والے لڑکوں کی تعداد ۹۰ سے ۹۵ فی صدی تک تھی۔ روبی (ROBIE) نے بھی امریکہ میں اس سلسلہ میں کچھ کام کیا ہے اُن کا خیال ہے کہ شاید ہی مشکل سے کوئی ایسا شخص نکلے، (لڑکے اور لڑکیوں دونوں میں) جو اس لذت سے بیگانہ ہو۔ ڈاکٹر کیتھرائن ڈیوس (DR. KATH ARINE DAVIES) نے اپنی توجہ صرف لڑکیوں کی طرف کرتے ہوئے حساب لگایا ہے کہ امریکہ کے کالجوں میں پڑھنے والی لڑکیوں میں سے ۶۰ فی صدی اس علت کا شکار تھیں۔ اُن کے اعداد سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لڑکیاں لڑکوں کے مقابلہ میں کم عمری میں اس علت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس صورتِ حال کے تحت بہتر یہی ہے کہ ہم شروع ہی سے اس بات کو مان لیں کہ یہ جلق مستثنیات میں سے نہیں ہے بلکہ قاعدہ عام ہے، اس علت کو ہم جنسی گمراہی سے تعبیر نہیں کر سکتے بلکہ ہم کو اسے ایک بالکل فطری جنسی مظاہرہ سمجھنا چاہئے۔ بقول (KRETSCHNER) "جلق کسی قسم کی جنسی گمراہی کی نشانی نہیں ہے بلکہ یہ (کثرت کا سے قطع نظر) ایک بے ضرر عبوری دور ہے اور ایک تندرست اور توانا جنسی جذبہ کی مظہر ہے۔ ہم اس کو جنسی گمراہی سے جب ہی تعبیر کر سکتے ہیں جب اس کا ورد صرف اسی کی خاطر کیا جائے، یعنی اس وقت جب کہ اس کی قدر و قیمت فطری فعل مباشرت سے بڑھ جائے اور یہ اس کی جگہ لیلے یعنی فطری مباشرت کے مواقع حاصل ہوتے ہوئے بھی ایک شخص اس سے کنارہ کش نہ ہو۔" ان چند الفاظ میں KRETSCHNER نے بڑی جامع اور صحیح تنقید کر دی اور بڑا اچھا صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ حاصلِ بحث یہ کہ عمر کے ارتقائی دور میں جلق بالکل فطری ہے لیکن اگر یہ مستقلاً عادی ہو جائے تو جنسی گمراہی ہے۔

یہاں یہ غور کرنا بھی ضروری ہے کہ طبی سائنس کے ارتقائی دور میں ڈاکٹری کے نظریات بھی اپنے عہد کے اخلاقی نظریات سے متاثر تھے۔ یہاں تک کہ اس زمانے میں عام خیال تھا کہ ناجائز جنسی تعلقات اپنے آغوش میں بیماریوں کے جراثیم چھپائے رکھتے ہیں۔ تپ دق، جسمانی اور نفسیاتی بیماریاں اور اسی قبیل کے دیگر امراض گویا اسی سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق رکھتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب میڈیکل سائنس نے ان اوہام سے چھٹکارا پا لیا ہے، لیکن پھر بھی کہیں کہیں ابھی تک پرانی لکیر کے فقیر ملتے ہیں۔

اصل میں جلق سے سب سے بڑا خطرہ وہ ذہنی الجھنیں ہیں جن میں بچے مبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ کثرتِ کار جو بڑھتی ہی جاتی ہے۔ وہ جو اس علت کے عادی ہو جاتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ وہ کسی ایسی قوت کے زیر اثر ہیں جو ان سے زیادہ قوت دار ہے۔ احساسِ کمتری، شرم، خوف اور ہراس کے بوجھ کے نیچے اس کا عامل دبتا چلا جاتا ہے بالآخر اسے خود سے نفرت ہونے لگتی ہے اور پھر اس خیال سے کہ لوگ اس کی حالت سے واقف ہو گئے ہوں گے وہ ان سے دور بھاگنے لگتا ہے اور بالکل ہی گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔

اگر کوئی بچہ ذرا اوائل عمری میں اس عمل کو شروع کر دے تو والدین کو چاہئے کہ وہ یہ کوشش کریں کہ بچہ

اس کو غیر معمولی اہمیت نہ دینے لگے۔ مریض کو یا ڈرا کر تو اس کا روکنا تقریباً ناممکن ہے۔ اگر یہ صورت اختیار کی گئی تو بچے زیادہ محتاط ہو جائیں گے اور زیادہ پوشیدہ طریقے پر کریں گے۔ زیادہ بہتر طریقہ تو یہ ہوگا کہ اس کی مدد کی جائے کہ وہ اپنی دیگر دلچسپیوں میں زیادہ تنوع پیدا کرے اور زیادہ سے زیادہ مشغول رہے تاکہ اُسے اس کا موقع ہی نہ ملے بالعموم وہی بچے جو زیادہ تر تنہا رہتے ہیں اس کا شکار ہوتے ہیں اگر بچے ذرا عمر میں بڑے ہوں تو اس مسئلہ کا حل اور اس مشکل کا مقابلہ نسبتاً آسان ہو جاتا ہے ہم اس سے صاف صاف کہہ سکتے ہیں کہ اب جبکہ وہ جوانی کے دروازے پر کھڑا ہے بچپن کی تمام عادتیں چھوڑ دینا ہی اُس کے لئے زیادہ بہتر ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح اور بچپن کی عادتیں اس نے چھوڑ دیں یا وہ خود بخود چھوٹ گئیں۔

لڑکیوں کے مسائل بلوغیت بالکل لڑکوں سے ملتے جلتے ہیں۔ جہاں تک "بدخوابی" کا تعلق ہے اس کی جگہ لڑکیوں کی "ماہواری" نے لے لی ہے۔ وہ لڑکیاں جو اپنی والدہ سے اس "حادثہ" کے متعلق پہلے سے کچھ معلومات حاصل کر لیتی ہیں وہ سیکڑوں ذہنی مصائب کا شکار ہونے سے بچ جاتی ہیں۔ دیگر جنسی مسائل اور مظاہرات کی طرح اس "حادثہ" سے بھی سیکڑوں توہمات وابستہ ہیں، بالخصوص غیر متمدن اقوام اور قبائلی اقوام میں تو بعض نہایت ہی عجیب و پر اسرار باتیں اس سے منسوب ہیں۔ چونکہ ان توہمات کا نفسِ مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لئے اسے نظر انداز کرتا ہوں۔

آخر میں اتنا اور عرض کر دوں اگرچہ پھر اس کا نفسِ مضمون سے بالواسطہ تعلق نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی یہ مسئلہ جنسی تعلیم و تربیت کے تحت آتا ہے وہ یہ کہ ایک بالغ اور سمجھدار نوجوان کی بہبودی اور ذہنی تندرستی کے لئے والدین کو گوشہ نشینی اور خلوت گزینی اختیار کر لینا از بس ضروری ہے گو کہ اس نصیحت پر عمل کرنا والدین کے لئے ذرا مشکل کام ہے مگر یہ امر واقعہ ہے کہ اس زندگی کی تگ و دو میں بالعموم وہی والدین زیادہ کامیاب اور بامراد ثابت ہوتے ہیں جو اس امر کی کوشش نہیں کرتے کہ وہ جا و بے جا اپنی اولاد کو اپنے خود ساختہ اصول اور حق کے نیچے دبا کر رکھیں۔ ایسے ہی والدین اپنی اولاد کے دلوں میں اپنے لئے ایک ایسی جگہ پیدا کر لیتے ہیں جو لازوال محبت اور عقیدت کی حامل ہوتی ہے۔ ایک آدمی دوسروں کے بنائے ہوئے اصولوں پر بالعموم نہیں چلا کرتا اس لئے ہمیں خود اپنی اولاد کی نئے اصول وضع کرنے میں، نئے تجربات کرنے میں زیادہ سے زیادہ مدد کرنا چاہیے چہ جائیکہ ہم اپنے جذبات میں اندھے ہو کر اور روایتی پندار کی آڑ لے کر خود ہی اُن کے تجربے اور عمل میں رکاوٹیں ڈالیں۔ ہر نئی نسل اپنے لئے ایک خاص لائحہ عمل تیار کرتی ہے، ایک خاص نعرہ وضع کرتی ہے اور اسی طرح اپنے جنسی مسائل کا حل بھی تلاش کرتی ہے۔ دوسروں کے بنائے ہوئے اصولوں کا پابند ہونے اور اپنی زندگی کو دوسروں کے بنائے ہوئے ڈھانچوں میں ڈھالنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں اپنی زندگی گزاریں۔

ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اُن کی اس نئی زندگی کے تجربے میں صرف ایک جذبہ کارفرما ہونا چاہیے اور وہ ہے نیکی، سچائی اور حسن کی لافانی قدروں کی جستجو!!

عابدہ

کیٹس

انگریزی ادبی ستاروں میں ــــ کیٹس مجھے سب سے زیادہ پسند ہے ! ــــ
کیٹس کا شمار رومانی ــــ بالفاظ دیگر فراری شعراء میں ہے ــــ دنیا اور اس کی گھناؤنی معاشرت ــــ بے روح تہذیب　جھوٹی محبت اور گناہ و تاریکی سے تنگ کردہ ایک ایسی دنیا میں بھاگ جانا چاہتا ہے جہاں خلوص و صداقت اور حسن و معصومیت کا راج ہو ــــ ! وہ حقیقتوں کا نہیں ــــ خوابوں کا شاعر ہے ــــ سنہرے سپنے ــــ رنگین خواب ــــ اور ان قوس و قزحی خوابوں کی دنیا کیٹس بہتر کوئی شاعر نہیں بنا سکا ــــ ! اس کی روح ایک ایسے عالم کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ جسے وہ نہ جانتے ہوئے بھی جانتا ہے ــــ جسے کبھی نہ دیکھنے پر بھی وہ اس کی عکاسی کر سکتا ــــ وہ آئیڈیل کا متلاشی ہے ــــ اس کے تخیل میں بسی ہوئی نور و نکہت کی وہ معصوم دنیا ــــ ! جہاں شباب لافانی ہو ــــ حسن لافانی ہو ــــ محبت لافانی ہو ــــ ! جہاں غم نہ ہو، آنسو نہ ہوں ــــ آہیں نہ ہوں ــــ مسکراہٹ ہو ــــ مسرت ہو !! ــــ　آہ ! کتنی مختلف ہے یہ دنیا ــــ خوابوں کی اس دلکش نگری سے ! ــــ

(Ode to a Nightingale):

The weariness, the fever and the fret,
Here, where men sit and hear each other groan
Where palsy shakes a few, sad, lasting grey hairs
Where youth grows pale and spectre-thin and dies
Where but to think is to be full of sorrows.
And leaden-eyed despairs,
Where beauty cannot keep her lustrous eyes
Or new Love pine at them beyond to-morrow

دنیا کی انقلاب مشربی پر صرف کیٹس کا نوحہ نہیں ــــ بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہر مٹ جانے والی شے ماتم کناں ہے ــــ : دنیوی عشرت و مسرت کی کتنی حقیقت افروز تصویر کھینچی ہے ــــ یہ دنیا ــــ جہاں خوشی بھی غم انگیز ہے ــــ جہاں تبسم بھی اشک آلود　! کیٹس کی دنیا غیر حقیقی ہونے پر بھی کتنی دلنواز و پرکشش ہے ــــ !

(Ode to a Nightingale)

O, for a draught of vintage
That I might drink and leave the world unseen
And with thee fade away into the forest dim

Fade far away, dissolve and quite forget
That thou among the leaves hast never known.

(Ode to a Nightingale) کیٹس کی بہترین نظم ہے ــــ جس میں دنیا بھر کے رومان کی روح سمٹ کر ابھر آئی ہے ــــ کیٹس کی فراری شخصیت اس نظم میں پورے طور پر اجاگر ہو گئی ہے ــــ رومانی شاعری میں ــــ انگریزی ادب اس نظم کا جواب نہیں رکھتا ــــ شیلے کی نظم To a Skylark مقابلہ میں لائی جا سکتی ہے ــــ مگر اس میں بھی شیلے کی مخصوص اصول پروری اور پختگی نمایاں ہے ــــ شیلے سے قلبی مسرت کا راز معلوم کرنا چاہتا ہے ــــ اس سے کچھ سیکھنے ــــ اس پر عمل کرنے اور اس جیسا ہو سکنے کی آرزو ــــ مگر کیٹس بلبل کے نغموں میں خود فراموش ہو جاتا ہے ــــ اور اس کی صرف یہ تمنا رہ جاتی ہے کہ وہ نغمہ پرداز ساحرہ کے ساتھ اڑ جائے ــــ! کیٹس کی کشش کا راز اس کی سادگی ــــ معصومیت اور الھڑپن ہے ــــ بلبل کے نام اس پیغام میں ــــ اس کا تصور دنیا ــــ اور فلسفۂ حیات ہے ــــ گہرے پانی کی سطح پر بکھرے ہوئے کنول کے شفاف پھولوں کی طرح ــــ صاف جھلک رہا ہے ــــ! دنیا اس کے لئے ایک رنگین غم خانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ــــ جہاں کسی قسم کے دکھ درد اور مکر و فریب کی کمی نہیں ــــ! درد و غم کے اس بحر بے کنار ــــ اور حسن و محبت سے معرا اس الم آباد سے جان چھڑا کر وہ بلبل کے ساتھ جنگل کی طرف اڑ جانا چاہتا ہے ــــ جہاں بلند درختوں کی گھنی پتیوں میں چھپی ہوئی بلبل دنیا کی تیرگیوں کو نہیں دیکھ سکتی ــــ وہاں پہونچ کر شاید وہ بھی سکون پا سکے ــــ شاید ان مصیبتوں، غموں اور مٹ جانے سے اسے بھی چھٹکارا مل جائے ــــ! کون جانتے ؟! ــــ

کیٹس کی قنوطیت ــــ رومان پرستی اور فراری ذہنیت حد سے گذرتی نظر آتی ہے ــــ مگر سچ تو یہ ہے کہ مسلسل ناکامیاں اور بے پناہ غم و رنج انسان کو فراری اور رومان پرست بنا ہی دیتے ہیں ــــ جس کے لئے دنیا میں کوئی کشش نہ ہو ــــ جس کی زندگی اسے غم و الم کے سوا کوئی تحفہ نہ دے سکتی ہو ــــ وہ اگر تلخ حقیقتوں سے منھ موڑ کر ــــ تخیل میں ایک رنگین فردوس بنائے تو کیا ہرج ہے ــــ!

صرف پندرہ سال کی عمر میں ماں اور باپ کی دائمی مفارقت نے کیٹس کو بے سہارا چھوڑ دیا ــــ تنگدستیوں نے جلد ہی اس سے اسکول بھی چھوڑا دیا ــــ! اور اگرچہ اسکول کی زندگی میں اس نے کسی خاص ذہانت کا ثبوت نہیں دیا ــــ مگر اسی زمانہ میں اسے مشہور اور مستند مصنفوں کی تصانیف پڑھنے کا بیحد شوق ہو گیا تھا ــــ! صرف اٹھارہ سال کی عمر میں اس نے محسوس کیا کہ وہ بآسانی اور اچھے شعر کہہ سکتا ہے ــــ خوش قسمتی سے لندن میں اس کی دوستی اپنے دور کے بہترین شعراء سے ہو گئی ــــ اور ان کی توصیف اور ہمت افزائی نے اسے غیر معمولی تقویت بخشی ــــ لیکن جب اس کی نظم Endymion شائع ہوئی تو اس پر بڑی کٹھن اور ہوش ربا تنقیدیں کی گئیں ــــ اس کی کم عمری اور نو مشقی کی بھی رعایت نہیں کی گئی ــــ! کمسن شاعر کا دل ٹوٹ گیا! ــــ مگر اس کی ہمت بڑی جواں مرد نکلی ــــ! اور اپنے شاعر دوستوں کی دلجوئی کی بنا پر اس نے شعر کہنا ترک نہیں کیا لیکن زمانہ بڑا ناشناس ہے ــــ غالب کی طرح اس نو عمر شاعر نے بھی زندگی بھر اپنی زندگی کے ماحصل اپنی شاعری پر جا و بیجا اور سخت قسم کے اعتراضات برداشت کئے ــــ اس غم ناکامی نے مسلسل علالت کی شکل اختیار کر لی ــــ مگر جب دل نے بھی آوارہ بخت شاعر سے بیوفائی کی تو اس کی صحت اور خراب ہوتی

چلی گئی ـــــ Miss Fanny Brawne کی محبت نے اس کی رہی سہی زندگی کا بھی خاتمہ کر دیا۔ چونکہ وہ غریب تھا ـــــ اور بیمار ـــــ "حاصلِ محبت" کو پا سکنا اس کے لئے ناممکن تھا ـــــ!

ابتدائے محبت میں لکھی ہوئی ـــ The Eve of St. Agnes ـــ رنگینیٔ بیان ـــ بلندیٔ جذبات، محاکات تصویر کشی کے لحاظ سے کیٹس کی بہترین نظم ہے ـــ یہ نظم احساسِ ناکامی سے قبل لکھی گئی تھی۔ لہٰذا اس سے زیادہ رومانی سحر طرازی کیٹس کی کسی دوسری نظم میں نہیں ـــ اس نظم کی ایک خصوصیت متضاد حالات و کیفیات کی عکاسی ہے ـــ شباب و پیری ـــ رنگینی و بے کیفی ـــ وغیرہ ـــ لیکن دراصل زبان کی رنگ آمیزی ـــ حسین محاورات و خوبصورت تشبیہات ـــ اور مصوری کے لحاظ سے یہ نظم کیٹس کی شاعری میں ممتاز درجہ رکھتی ہے ـــ! ـــــ کے دنیوی زیب و زینت سے آزاد ہو کر ـــ سادگی سے سو جانے کو ـــ کتنے حسین انداز و دلکش الفاظ میں بیان کیا ہے ـــ! . . .

Blinded alike from sunshine and from rain
As though a rose should shut and be a bud again

پھر اس کے سو جانے کے متعلق :-

And Madeline asleep in lap of legends old.

"پرانی کہانیوں کی گود میں سو جانا" ـــ کتنا رومانی تخیل ہے ـــ!!

اسی طرح ــــــ

A Cloth of woven crimson, gold and jet.
Sudden a thought came like a full blown rose
Flushing his brow in his pained heart,
Made purple riot.

اس اکیلی ہی نظم میں اس قسم کی بیسوں سحر انگیز تشبیہات اور نادر محاورات مل سکتے ہیں ـــ پُر شور موسیقی کی اس سے بہتر تعریف کون کر سکتا ہے :-

The music, yearning like a God in pain.

"جیسے کوئی دیوتا شدتِ کرب سے کراہ رہا ہو!"

بوقتِ عبادت ـــ Madeline کی کتنی حقیقی ـــ پُر مسرت اور دل آویز تصویر کھینچی ہے ـــ!

Rose-bloom fell on her hands together prest,
And on her silver cross soft amethyst
And on her hair a glory like a saint
She seemed a splendid angel, newly drest
Save wings for heaven :-

مناظرِ قدرت اور فطرت کے حسن و دلکشی کی نقاب کشائی کیٹس کے خاص موضوعِ شاعری ہیں ـــــ اس کی ہر نظم دلفریب مناظرِ قدرت سے لبریز ہے ـــ! اتنا ضرور ہے کہ کیٹس کی ہمنوا فطرت نے ـــــ

قدرت کے ہر منظر میں سسکیاں بھر دی ہیں ـــ آہیں اور آنسو ـــ ! درد ـ کراہ ـ سوز ! ـــ میرے خیال میں غم خوشی سے زیادہ ہی رنگین ہوتا ہے ـــ زیادہ جاندار ـــ اور زیادہ پرکشش ! کیٹس کی میرے نزدیک سب سے بڑی کشش اس کی غم پرستی اور قنوطیت ہے ـــ ! اس کی رنگین سے رنگین ـــ اور رومانی سے رومانی نظم کے پس منظر میں ـــ درد و یاس کا ایک گہرا سمندر لہراتا نظر آتا ہے ـــ سوز و حسرت کا وسیع ریگزار ـــ غم نصیب شاعر کی ساری زندگی ہی سوز و الم اور حسرت و یاس کا اندوہناک امتزاج تھی یہی وجہ ہے کہ اداس و مغموم مناظر کی کیٹس نے بڑی اچھی عکاسی کی ہے۔ اس کی ترنم پرور نظم "ـــــــــــ" کے ابتدائی تین بندوں میں ـــ خزاں کے اداس موسم میں ـــ اجڑی سی نہر کے کنارے آوارہ و پریشان پھرتے ہوئے مغموم شخص کی بڑی حسرت بھری تصویر کھینچی گئی ہے ـــ عالم الخرافات سے کیٹس کو عشق تھا۔ اور اس نظم میں یہ تاثر کیٹس کی تمام نظموں سے زیادہ نمایاں ہے ـــ نظم کی سب سے بڑی خوبی ـــ مبہم کنایات ہیں ـــ جن سے جستجو کی تڑپ پیدا ہوتی ہے ـــ اور پڑھنے والا خود کو ایک طلسمی دنیا ـــ دیوؤں اور پریوں کی نگری میں محسوس کرنے لگتا ہے ـــ حیران سا ـــ گھبرایا ہوا ـــ مگر تجسس و دلچسپی سے ورڈزورتھ اور شیلے کی طرح ـــ کیٹس بھی نقاشِ فطرت ہے ـــ ! لیکن اس کی شاعری کوئی اخلاقی، سیاسی یا فلسفیانہ مقصد نہیں رکھتی ـــ اس کا مقصد تو صرف قدرت کے حسن و رنگینی کی نقاب کشائی ہے ـــ اسے ہر چیز میں حسن نظر آتا ہے ـــ فطرت میں ـــ آرٹ میں ـــ اور انسانی زندگی میں ـــ ! مگر وہ صرف حسنِ بہار آگیں کا شیدائی نہیں ہے ـــ اس کے نزدیک خزاں بھی حسین ہے ـــ زرد پتے ـــ خشک ٹہنیاں ـــ مرجھائے ہوئے پھول اور غبار آلود آسماں ـــ اس کی نظر میں یہ بھی لافانی شعریت اور بے پایاں حسن کے مالک ہیں ـــ !

خزاں کے مغموم موسم میں ـــ بہار کی نشیلی رنگینیوں اور دلکش نغموں کو یاد کرتے ہوئے وہ پکار اٹھتا ہے

(Ode to Autumn)

Think not Them, thou hast thy music too.

اس کے نزدیک حسن صرف مرئی اشیاء میں نہیں ـــ بلکہ تخیل کا حسن اور تصور کی خوبصورتی بھی جذباتِ حسن پسندی کو تسکین دے سکتے ہیں ـــ اپنی طویل نظم "ـــــــــــ" میں بڑی خوبصورتی سے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے ـــ یہی نہیں بلکہ کیٹس کے خیال میں غیر مرئی اشیاء مادی چیزوں سے زیادہ حسین و پرکشش ہیں ـــ انجان اور ان دیکھی چیزوں سے دلچسپی رکھنا شاید فطرتِ انسانی میں داخل ہے ـــــــ

(Ode to a Grecian Urn)

Heard melodies are sweet, but those unheard,
Are sweeter — — — — — — —

کیٹس حسن کا پجاری ہے ـــ خواہ وہ کہیں اور کسی صورت میں ہو ! اگرچہ اس کا یہ حسن بھی آنسوؤں میں نہایا ـــ اور سسکیوں میں گھرا ہوا ہے ـــ مگر شاید یہی وجہ ہے کہ کیٹس سے زیادہ موثر اور پرسوز شاعری کسی دوسرے شاعر کی نہیں ـــ اور بقول خالدہ ادیب خانم :- "جو رونا رلانا نہیں جانتا ـــ وہ بہت کچھ ہو سکتا ہے مگر ـــ آسمان کے حسین تاروں کی قسم ! شاعر نہیں ہو سکتا ـــ" چنانچہ کیٹس شاعر ہے ـــ اور صرف شاعر ـــ ! جہاں شیلے نزاکتِ تخیل اور نفاستِ تصور میں لاجواب ہے ـــ ورڈزورتھ "پیغمبرِ فطرت" اور شاعرِ انسان ہے

—— وہاں کیٹس حواس خمسہ کا شاعر ہے —! پاکیزہ، بے تکلف اور درد انگیز احساسات کا شاعر —— ذائقہ بو اور لمس کا شاعر — اور ساتھ ہی — بے پروائی — خنک مزاجی — افسردگی اور سکون و خاموشی کا شاعر —— وہ "رنگ" کا شاعر ہے — اور "حسن" کا شاعر — !!! — Endymion میں اس کا یہ نظریہ حسن مجسم ہوگیا ہے

A thing of beauty is a joy forever, ——
Its loveliness increases, it will never
Pass into nothingness.

حسن جو فانی نہیں — روح کا حسن اور دل کا حسن — ایسا حسن جو ایک ابدی مسرت ثابت ہو سکے ——
لیکن وہ صرف حسن کا شاعر نہیں — وہ سچائی و صداقت کا جویا ہے Ode on a Grecian Urn

Beauty is truth, truth beauty that is all
Ye know on earth, and all ye need to know.

حسن صداقت ہے — اور صداقت حسن — وہ اس سے زیادہ کچھ جاننا نہیں چاہتا —— !

کیٹس نے زندگی کی عشرتوں کا نظارہ کیا — اور اس کے درد کو بھی سیکڑوں دوسرے انسانوں کی طرح محسوس کیا —! جذبات کی بلندی و آسودگی — خواب زدگی —— اور لازوال صداقت و فانی حسن کی پیہم جستجو — کیٹس کی خاص کشش ہے —!

کیٹس کی عمر پختگی کو نہیں پہونچی —— لہٰذا اس کے یہاں عقلمندی اور پختہ فنکاری کی تلاش غلطی ہے وہ محسوسات کا شاعر ہے — اور اس قسم کے متاثر کن اشعار انگریزی شاعری میں بہت کم ملینگے ——

(Ode to a Nightingale)
And mid May's eldest Child,
The Coming musk-rose full of dewy wine
The murmurous haunt of flies on summer eves,

اس کی نظر میں شاعری محض خوشی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ نہ کہ درس و تدریس کا آلہ —— شاعر کا کام "تحریر" ہے — "تعمیر" نہیں —!

کیٹس کوئی بڑا عالم نہیں —— اس کی تعلیم بھی ادھوری رہ گئی تھی — اس پر بھی اس نے مشہور و مستند اہل قلم کی تصانیف کا وسیع مطالعہ کیا —! شیکسپیر اور اسپنسر کا اس پر بہت اثر رہا — لیکن اس کی شاعری یونانی علم الخرافات (Mythology) اور عہد متوسطا کی رومان پرستی سے بیحد متاثر ہے — جہاں محبت سکون روح نہیں عذاب زندگی ہے — اور حسن سادہ و معصوم نہیں — قاتل و پرکار ہے —! دراصل اسی تاثر نے اس کی شاعری کو بیحد رنگین و دلکش بنا دیا ہے —— اس کی ہر نظم —— خواہ اس کا کچھ ہی موضوع ہو —— رومان کی تابشوں سے منور ہے ——

کیٹس کی شاعری میں خامیاں اور معائب ہیں —— اور کافی ہیں —! ضبط کی کمی —— تخیل کا الجھاؤ اور ناہمواری — حد سے بڑھی ہوئی قنوطیت — جذباتیت اور شیرینی — ! —— لیکن وہ حذا داد صلاحیتوں نے کیٹس کو صف اول کے شعراء میں ممتاز درجہ دیدیا ہے —! محاکات و تصویر کشی —— اور اس کی تشبیہات

اور استعارات کی ندرت و رنگینی اور زبان و محاوروں کی جدت و سحر طرازی !۔۔۔

کیٹس سے زیادہ محاکاتی شاعری کسی دوسرے شاعر کی نہیں۔۔۔ تصویر کشی کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ ہر نظم پڑھنے والے پر وہی اثر رکھتی ہے جو کسی کامیاب مصور کی تصویر۔۔۔ دوسری طرف الفاظ و محاوروں کے بہترین انتخاب و جدت طرازی نے کیٹس کو صرف بہترین محاکاتی شاعر۔۔ اور مصور زندگی ہی نہیں بنا دیا ہے۔۔۔ بلکہ اس کے کلام میں وہ زور و کمال اور خوش اسلوبی و فرحت بھر دی ہے جن کا شیکسپیر استاد مانا جاتا ہے۔۔۔ اسی چیز نے میتھیو آرنلڈ کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ :۔۔۔ "He is with Shakespeare"

نادر و حسین تشبیہات و استعارات کی کیٹس کے یہاں کوئی کمی نہیں۔۔۔ مگر دو لفظ اس کے پسندیدہ معلوم ہوتے ہیں Rose اور Silver ! چنانچہ اس کی دنیا کی ہر چیز "سیمیں" ! ہے۔۔۔ یا "گلاب آسا" ہے۔

محاکات و تصویر کشی۔۔۔ اور زبان کی خوبصورتی کے بعد۔۔۔ کیٹس کی بڑی خصوصیت اس کی نظموں کا ترنم ہے۔۔۔ کیٹس کے Odes - La Belle Dame Sans Merci اور Hyperion ۔۔۔ اس سلسلہ میں خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔۔۔ اور اگرچہ اس کے یہاں شیلے کی سی بیقرار نغمگی نہیں۔۔۔ مگر پھر بھی وہ بہترین ترنم و موسیقیت کا مالک ہے۔۔۔ جیسے کوئی شفاف ندی۔۔۔ آہستہ خرامی سے۔۔۔ ایک مسلسل نغمہ پیدا کرتی ہوئی۔۔۔ بغیر کسی رکاوٹ کے بہہ رہی ہو۔۔۔!

اس میں شک نہیں کہ کیٹس کی کامیاب شاعری کا زمانہ بہت مختصر ہے۔۔۔ مگر زندگی کے آخری ایک ڈیڑھ سال میں لکھی ہوئی کیٹس کی نظمیں انگریزی ادب میں ہمیشہ درخشاں رہیں گی۔۔۔ کیٹس کے Odes , La Belle Dame Sans Merci , Hyperion اور The Eve of St. Agnes کیٹس کی بہترین تخلیقات ہیں۔۔۔ اور کون جانے کتنی بہتر چیزیں اور وجود میں آتیں۔۔۔ مگر شاعر کی بے وقت موت ! جسے انگریزی ادب کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان کہنا بیجا نہیں۔۔۔ ! فروری ۱۸۲۱ء میں۔۔۔ صرف ۲۵ سال کی عمر میں انتہائی کرب انگیز زندگی گذارتے اور مسلسل بیماری برداشت کرتے ہوئے۔۔۔ روم کے اُفق میں۔۔۔ ادب کا یہ درخشندہ مگر نوخیز ستارہ۔۔۔ ہمیشہ کے لئے کھو گیا۔۔۔!

شیلے نے مرثیہ Adonais کہا۔۔۔ جس کے آخری بند کے آخری دو شعر سن لیجئے۔۔۔

I am borne darkly, fearfully afar
Whilst burning through the inmost veil of Heaven
The soul of Adonais, like a star,
Beacons from the abode where the Eternals are

"کیٹس"

مکین احسن کلیم

رسالوں کا قحط

ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان میں رسالے بالکل ہی ناپید ہو گئے۔ دہلی کے رسالے اور وہاں بھی صرف ساقی اور جامعہ ہی رہ گئے تھے۔ فرقہ وارانہ ہنگاموں کا شکار ہو گئے۔ لاہور سے آمد و رفت کا سلسلہ کچھ اس طرح منقطع ہو گیا کہ وہاں کے رسالے اس طرف یا تو آ ہی نہیں سکتے یا آئے بھی تو صرف دو ایک اور وہ بھی کبھی کبھی۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ اردو جن علاقوں میں روزمرہ کی زبان ہے اور جہاں وہ عام طور پر بولی چالی جاتی ہے وہاں سے کوئی ایسا رسالہ نہیں نکلتا جو موجودہ دور کے صالح اور صحت مند ادب کا آئینہ دار ہو۔ ادب کی ترقی اور ترویج میں قاعدہ سے یوپی کو دوسرے صوبوں سے پیش پیش رہنا چاہئے تھا۔ لیکن وہی سب سے پیچھے ہے ایسا نہیں ہے کہ یہاں والوں نے اس کمی کو محسوس نہیں کیا ہو۔ یہ کمی بہت شدت کے ساتھ محسوس کی گئی اور اسے پورا کرنے کی ایک دو نہیں بلکہ لاتعداد کوششیں کی گئیں۔ بعض لوگوں نے خلوص کے ساتھ ادب کی خدمت کے لئے رسالے نکالے بعض کا مقصد صرف روپیہ پیدا کرنا تھا اور بعض ایسے بھی تھے جو ایک ہی وقت میں دونوں مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن ان میں سے کسی کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی اور کسی رسالے کے ایک دو شمارہ سے زیادہ نہ نکل سکے۔

یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو رسالے نکالنا چاہتے ہوں نہ ان کی کمی ہے جو رسالے پڑھنا یا خریدنا چاہتے ہوں کیوں کہ ابھی تک لاہور اور دہلی کے رسالے خریدے ہی جاتے تھے اور اب وہ یہاں آنا بند ہو گئے ہیں۔ بلکہ بہت سے لکھنے پڑھنے والے تو رسالوں کے ناپید ہو جانے کی وجہ سے اپنی ادبی زندگی میں بڑا خلا محسوس کرنے لگے ہیں۔ اس صوبے میں اچھے لکھنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے پھر بھی اس صوبے سے رسالے نہیں نکلتے اور نکلتے ہیں تو چلتے نہیں۔ آخر کیوں؟

یہاں سے رسالے نہ نکل سکنے کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ رسالے نکالنے کی کوشش زیادہ تر تو شاعروں اور ادیبوں نے کی۔ ہر ادیب معاف کیجئے گا تھوڑا سا غیر ذمہ دار ہوتا ہے (کیٹس نے بھی کہا تھا کہ شاعر ہی سب سے بڑا غیر شاعر ہوتا ہے) شاعر اور ادیب سوچتے زیادہ ہیں اور سوچتے سوچتے معلوم نہیں کہاں سے کہاں پہونچ جاتے ہیں۔ اور کام کے عملی پہلوؤں اور دشواریوں پر بہت کم نظر رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں زیادہ تر شاعروں اور افسانہ نگاروں کی دوستی پر بھروسہ ہوتا ہے اور وہ کسی طرح کی دوڑ دھوپ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ گھر بیٹھے انھیں مضامین مل جائیں۔ ایسے لوگ رسالے نکالنا صرف "ادبی عیاشی" سمجھتے ہیں اور رسالے کو جاری رکھنے کے لئے کسی کوشش یا سرمائے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ پہلا پرچہ معینہ تاریخ کے تین چار مہینے کے بعد نکلتا ہے دوسرا دو مہینے کے بعد مضمون نگاروں، کاتبوں اور پریس والوں کی شکایت دیر کی معذرت اور اس وعدے کے ساتھ نکلتا ہے کہ آئندہ پرچہ ضرور وقت پر نکل جائے گا۔ لیکن اس کی اشاعت کی نوبت چھ مہینے بعد بھی نہیں آتی۔

خود لکھنؤ سے پچھلے چار مہینے کے اندر کم از کم ایک درجن نئے رسالے نکلے لیکن ان میں سے ایک بھی تو ایک مہینہ سے زیادہ نہیں چل سکا کیوں کہ ان میں سے ایک بھی نہ تو اس ارادے سے نکالا گیا کہ اسے ہر قیمت پر جاری رکھا جائے گا۔ اور نہ اس کے نکالنے والوں میں اتنی استطاعت اور اہلیت تھی کہ وہ اتنا مشکل کام کر سکیں۔ ان کا معیار بھی پست یا زیادہ سے زیادہ اوسط درجہ کا تھا۔ عام طور پر ایسے رسالے شکایت کرتے ہیں کہ انھیں خریدار نہیں ملتے

بلکہ یہ کلیہ بنا لیا گیا ہے کہ اس صوبے والے رسالے خرید کر پڑھنا جانتے ہی نہیں، لیکن یہ الزام انصاف پسندی پر مبنی نہیں ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ لوگ نئے رسالے خصوصاً لکھنؤ سے شائع ہونے والے رسالوں کے مستقل خریدار بننا نہیں چاہتے کیونکہ انھیں یقین ہوتا ہے کہ رسالہ دو تین مہینے سے زیادہ نہیں چلے گا۔

اس صوبے سے رسالے نکالنے میں کچھ دشواریاں واقعی ہیں بھی۔ مثلاً یہاں کتابت و طباعت اچھی نہیں ہو سکتی لیکن اس کا سبب خود اس صوبے کی بے عملی ہے انھوں نے ادبی خدمت کا معیار صرف مشاعروں، ادبی نوک جھونک اور معاصرانہ چشمک کو بنا لیا اور اسی کو ادب اور ادبیت کی معراج سمجھنے لگے۔ اردو مطابع اور ناشرین کی حوصلہ افزائی کی ہی نہیں گئی۔ اور یہاں کتابوں کا کاروبار فروغ نہیں پا سکا۔ لکھنؤ والوں کی تنزل پرستی اور ان کے انحطاط اور جمود سے اس کے علاوہ اور کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ اور اس کا نتیجہ ہے کہ آج لاہور کے علیحدہ ہونے اور دہلی کے ہنگاموں کے بعد ہمارا دامان ادب رسالوں سے خالی نظر آتا ہے۔ لکھنؤ کے رسالوں میں صرف "نگار" ہی ایک ایسا ہے جو سلامت روی کے ساتھ برابر نکلتا رہتا ہے لیکن اس میں لکھنے اور پڑھنے والوں کا دائرہ بہت محدود ہے اور بہت سے لوگ اسے بھول سے گئے ہیں۔ بہرصورت یہی وجہ کیا کم ہے کہ اس نے زمانہ کی ناسازگاریوں کا پامردی سے مقابلہ کیا اور طرح طرح کی دشواریوں کے باوجود ابھی تک جاری ہے اسی طرح معارف بھی اب تک جاری ہے اور یہ مستحق ستائش و مبارکباد ہے۔ نئے رسالوں میں بھوپال کا افکار ہی ایک ایسا رسالہ ہے جو جدید اور بڑی حد تک صحت مند ادب کی ترجمانی کر رہا ہے اور کسی نہ کسی طرح نکلتا جا رہا ہے۔

ان تین رسالوں کے علاوہ معلوم نہیں کتنے نئے رسالے حشرات الارض کی طرح نکلے۔ کسی نے دعویٰ کیا کہ وہ صرف ترقی پسند ادب کا آئینہ دار ہوگا۔ کوئی مدعی ہوا کہ اس کا ایڈیٹوریل بورڈ مسلمہ ادیبوں پر مشتمل ہے۔ غرضیکہ جتنے رسالے جاری ہوئے اتنے ہی اصول اور معیار پیش کئے گئے۔ لیکن ان میں سے اکثر کا پہلا ہی شمارہ آخری شمارہ بھی نکلا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس شہر، صوبے یا ملک میں کسی رسالے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ گنجائش ہے لیکن ہر رسالے یا ایسے رسالے کی نہیں جس کا صرف نمونہ کا پرچہ نکل کر رہ جائے۔ اگر خلوص کے ساتھ کوشش کی جائے، استقلال سے کام کیا جائے اور کافی سرمایہ لگایا جائے تو یہاں سے رسالے نکل ہی نہیں سکتے بلکہ بہت کامیاب بھی ثابت ہو سکتے ہیں کیوں کہ انڈین یونین میں معیاری رسالوں کی کمی بہت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے۔ اور تمام شاعر اور ادیب ان لوگوں کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں جو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے عملی قدم اٹھائیں گے۔ رسالے ہماری ادبی زندگی اور ترقی کا اہم جز ہیں ان سے ادب اور ادیب کی تدریجی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا رہتا ہے کہ ادب کے کیا رجحانات ہیں۔ ہمارے شاعر اور نثر نگار کدھر جا رہے ہیں اور ادب نے کتنی ترقی کی۔

ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہم پہلے کی طرح اب بھی لاہور کے رسالوں کے دست نگر رہیں اور آثار بھی کچھ ایسے ہی نظر آ رہے ہیں اس سے اتنا تو ضرور ہو گا کہ انڈین یونین کے ادیب کی نگارشات کو عوام تک پہونچنے کا ذریعہ مل جائے گا۔ لیکن خود انڈین یونین میں اردو زبان کی ترقی کہاں ہو سکے گی۔ خصوصاً موجودہ حالات میں جب یہاں اردو کو مٹنے سے بچانا اور اس کی ترقی کے لئے پوری پوری کوشش کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔

(قومی آواز، لکھنؤ)